پسِ آفاق

علامہ طالب جوہری



پسِ آفاق

پسِ آفاق

علامہ طالب جوہری

کلاسیک
42- دی مال، لاہور

آغا امیر حسین

کلاسیک ناشر و تاجر

چوک ریگل۔ ۴۲ دی مال لاہور ۵۴۰۰۰

فون: 37312977 فیکس: 37323963

E-mail:classicpublisher@yahoo.com

E-mail:classicpublisher@hotmail.com

www.classicpublishers.com

 O مئی 2012ء O قیمت: -/350 روپے

طابع:

سید ندیم حسین آغا

سپوتنک پرنٹرز

13-C فین روڈ لاہور

موبائل: 0300-4442227

فون: 92-42-37355957

ای میل: nadeemagha8@hotmail.com

فہرست

قصیدہ

نظم

غزل

نظم

غزل

نظم

غزل

نظم

سرِ آغاز

وقت کی دھوپ سے بچ کر جو نکل جائے گا
وہ کسی سایۂ دیوار سے جَل جائے گا

کھیت تو بانٹ دیئے میں نے عزیزوں میں مگر
کس کے کاندھے پہ مرے بعد یہ ہل جائے گا

شمع یہ سوچ کے جلتی ہے سرِ طاقِ وجود
موم کا جسم حرارت سے پگھل جائے گا

بڑا طویل ہے تاریخِ اِرتقا کا سفر
حَجَر کے عہد سے لے کر بہ عہدِ سیرِ قمر

ہر ایک گام پہ اپنے نشاں بناتی ہوئی
ازل کے دن سے ہے تاریخ یوں ہی گرمِ سفر

فرازِ کوہ پہ فرہاد کی جگر کاوی
نشیبِ ارض میں کِسریٰ کے طاق کا منظر

اَشُوریوں کی حکومت کی محو تحریریں
عیاں لباسِ قدامت میں نَینویٰ کے کھنڈر

سکوتِ دامنِ صحرا میں مصر کے اَہرام
ہجومِ شہر میں یونان و ہند کے مندر

علی کے شہر میں وادی السّلام کی قبریں
بُتوں کے دیس میں گوتم کی معرفت کا شجر

جبینِ بحرِ عرب پر مقامِ دیبل کا
بلندیوں کے نشیمن میں درّۂ خیبر

غرضکہ آج بھی گویا ہیں یہ قدیم آثار
زمین اصل میں ہے قافلوں کی راہ گزر

نہ جانے کتنے ممالک مٹے ہیں مثلِ حباب
نہ جانے کتنے تمدّن بُجھے ہیں مثلِ شرر

اور اس طویل سفر کی صعوبتوں کے بعد
اب اپنی منزلِ آخر پہ آ رہا ہے بشر

مگر ابھی ہے وہی رسمِ دورِ شورش و شر
مگر ابھی ہے وہی تیرگیٔ عہدِ حجر

ابھی کہ فتنۂ تسلیط ہے قیامت خیز
ابھی کہ جلوۂ تہذیب ہے بلا پرور

ابھی کہ فکر ہے نامحرمِ پیامِ کتاب
ابھی کہ عقل ہے ناواقفِ رموزِ خبر

جھگڑ رہے ہیں سر آگہی و سنگ رسوم
الجھ رہے ہیں گریبانِ عقل و دستِ بشر

غرورِ دانشِ عہدِ جدید سُن رکھے
بس ایک ذات میں ہے منحصر نجاتِ بشر

جھکے ہیں سجدۂ تعظیم کو دماغ و نظر
خیال میں ہے کسی واقعہ کا پس منظر

وہ آرہا ہے چَراگہ سے ایک پیغمبر
جِلَو میں اپنے، حلیمہ کی بکریاں لے کر

جبینِ صاف سے لپٹی ہے ریت صحرا کی
لباسِ پاک سے چمٹی ہے گردِ راہ گزر

قریب شام ہے، گھر کو ہے جلد جلد رواں
قدم بڑھائے ہوئے، راستوں سے کترا کر

یہ ریگزار یہ ٹھنڈی ہوا یہ شب کا نزول
کہ جیسے بارشِ الہام قلبِ شاعر پر

مُعلّقات کے اے شاعرو کدھر ہو سنو
سنو کہ کیا ہے حدِ آخرِ کلامِ بشر

سنو کہ پوچ ہے تعریف اسپِ تازی کی
سنو کہ لغو ہے سینِ ناقہ و اشتر

سنو کہ نجد کے صحرا کا ذکر ہے بے کار
سنو کہ عشق و محبت کا تذکرہ ہے لچر

سنو کہ میرے قصیدے کی مرکزی تخئیل
فقط ہے ذاتِ محمدؐ، نہ کوئی گھر نہ کھنڈر

تمہیں ہے سورۂ کوثر کی آیتوں کی قسم
سنو کہ آج میں کرتا ہوں مدحِ پیغمبر

ازَل پناہ، اَبد مقتدا، جہاں رہبر
تو ' اُمتوں کے بیاباں میں ہے خدا کا شجر

تِری نظر ہے بیاضِ عدم کا شیرازہ
تِرا نَفَس ہے کتابِ وجود کا مِسطر

یہ آفتاب ہے دراصل تیرا عکسِ جمال
یہ چاندنی ہے حقیقت میں تیری گردِ سفر

پہنچ سکی نہ جہاں فلسفے کی فکرِ عظیم
جہانِ زیست کا تو ہے وہ آدمِ اکبر

عطا ہوا ہے ترے نور کے وسیلے سے
ازل کو نغمۂ کُن، کُن کو فکرِ خلقِ بشر

نفس کو آمد و شُد، زندگی کو رازِ بقا
فلک کو دَورِ مسلسل، زمین کو محور

ملک کو ذوقِ عبادت، علوُم آدم کو
نیاز نوح کو، ادریس کو شعور و نظر

حیات خضر کو، داوٗد کو خوش الحانی
مسیح کو دلِ طاہر، کلیم کو تیور

غنائے فقر خدیجہ کو، فاطمہ کو جگر
علی کو قلب، حسن کو زباں، حسین کو سر

تعزیت

غمزوں کا ستارۂ درخشاں
ماتھے کی شکن میں سو رہا ہے
پلکوں سے اُتر کے قطرۂ اشک
رخسار پہ خشک ہورہا ہے

یہ اتنی شدید بددلی کیوں
ہے آج یہ پیچ و تاب کیسا
آنکھوں کی چمک بجھی ہوئی ہے
یہ خود پہ نیا عذاب کیسا

توڑو یہ اُداسیوں کے بندھن
توڑو مُہرِ لب و دہن بھی
میں وہ دُرِ بے صدف ہوں جس کو
پردیس بنا رہا وطن بھی

کیا فرق پڑے گا موسموں پر
پھولوں کے یہ رنگ کم نہ ہوں گے
ساری دلچسپیاں تو ہوں گی
اس گاؤں میں ایک ہم نہ ہوں گے

لہراتے رہیں گے دھان کے کھیت
پھولے گی ترائیوں میں سرسوں
شاخوں میں جدائیوں کے نغمے
کوئل گایا کرے گی برسوں

جاڑے کی طویل رات میں جب
در آئیں اندھیرے بام و در میں
ڈسنے لگے جب تمہیں اداسی
گرمی کی طویل دوپہر میں

اندیشۂ حال میں الجھ کر
تم خود سے کبھی خفا نہ ہونا
بے رشتگیٔ زبان و دل سے
بہتر ہے کہ آشنا نہ ہونا

میں موسمِ نخلِ دلبری ہوں
قسمت میں ہے برگ و بار کرنا
پھر لوٹ کے آؤں گا کسی دن
دیکھو، مرا انتظار کرنا

جاتا ہوں کہ دور جاکے میں بھی
تنہائی میں ایک آہ بھراوں
میں تم کو تو دے چکا تسلّی
خود سے اب تعزیت تو کرلوں

تضادات

جو سُن سکو تو سُنو داستانِ شامِ اَلَم
وداعِ دوست کے لمحو تمہیں خدا کی قسم

وطن سے دوٗر بہت دوٗر ایک بستی میں
کنارِ سرو، سرِ کوہسارِ ملکِ عجم

ہجومِ شوق کی آندھی میں پَر فشاں تھا شعور
قریب بیٹھے ہوئے بھی بہت اُداس تھے ہم

بُجھی بُجھی ہوئی کیفیتوں کا ایک ہجوم
لبوں پہ مہرِ خموشی سیاہ آنکھ میں نَم

وہ منجمد لبِ نازک پہ چاہتوں کی کتھا
وہ مضمحل جسدِ مرمریں میں خواہشِ رم

فصیلِ شوق پہ نادیدہ فاصلوں کی کمند
وہ قربتیں جو بچھڑنے کے واسطے ہوں بہم

نگاہِ یاس کے سائے میں خامشی کا سفر
گلی کا موڑ، چراغوں کی روشنی مدھم

وہ ایک دوُر سے آتی ہوئی صدائے وداع
پھر اس کے بعد شکستِ خیال کا ماتم

ہم ایسے لوگ تضادات کے ستائے ہوئے
کھڑے ہوئے ہیں خود اپنی ہی لاش اُٹھائے ہوئے

نہ انتہائے سفر ہے نہ راہِ شوق کی حد
سرِ تعیّنِ منزل ہے منطقی رد و کد

سرابِ وہم سے پانی نچوڑنے کے لئے
بھٹک رہے ہیں بیاباں میں تِشنگانِ خرد

یہ رہزنوں کی قیادت میں کاروانِ شُعور
یہ جاہلوں کی شہادت پہ آگہی کی سند

خوشی یہ ہے کہ بڑی طاقتوں کی چوکھٹ سے
بقدرِ ظرفِ طلب مل رہی ہے اپنی رسد

مُعاشرت کہ سرِ شاہراہِ فکر و شعور
پرانے وقتوں کا ٹوٹا ہوا سا اک معبد

مُفاہمت کہ سرِ آدمی پہ دشت کی دھوپ
منافقت کہ خود اپنی ہی چھاؤں میں برگد

رہے گا تنگ روایات کا لباسِ کہن
بہت بلند ہے ماہیّتِ شعور کا قد

غرض کہ آج انہیں اُلجھنوں میں ہے انسان
فریب خوردۂ علم و گزیدۂ ابجد

یہ فکر و فن کا دیا عقل کے اندھیرے میں
کھڑا ہو جیسے ابوجہل اپنے ڈیرے میں

بھٹک رہا ہے بشر بے نشان و بے آہنگ
سیاہ رات کی تاریکیوں میں ششدر و دنگ

نہ جانے کتنے سِتارے جلا وطَن ہوکر
نکل گئے ہیں خلاؤں میں سینکڑوں فرسنگ

قریبِ ارض وہ اُلجھی ہوئی خیال کی ڈور
حدِ اُفُق پہ وہ کٹتی ہوئی نظر کی پتنگ

وَجودیَت کی گھنی جھاڑیوں کی اوٹ ـــ
بشر کی تاک میں ہیں فلسفہ کے گُرگ و پلنگ

بُتوں کے ہند سے کنفیوشیس کے چین تلک
نشانِ پستیِ انسانیت ہے سنگ بہ سنگ

سکونِ بسترِ ابلیس و جسمِ خواب آلود
شکست ہوگئے اعصابِ حکمت و فرہنگ

شعارِ حکمت و دانش طلسمِ ہوشربا
شعورِ صنعت و حرفت خیال کا نیرنگ

کہو کہ کوئی شناور بچے تو کیسے بچے
کہ دامِ موج میں ہیں حلقہ ہائے کامِ نہنگ

یہ کن سیاہ طلسمات کے حصار میں ہے
کہ عقل اب بھی تضادات کے فشار میں ہے

اور میں

عہدِ ماضی، اجنبی قریہ، عَجم کی سرزمیں
پھر وہ اک منظر کہ اک چہرہ پہ آنکھیں جم گئیں

مطمئن موجوں کے آئینے پہ اک کنکر گرا
دائرے اُبھرے، تموّج بڑھ گیا، لہریں اٹھیں

اجنبیت نے کیا اس کی نگاہوں سے سوال
نیم وا پلکیں حیا کے بوجھ سے جھکتی گئیں

شوق نے پھینکی حیا پر آشنائی کی کمند
ناخنِ فطرت سے گویائی کی گرہیں کھل گئیں

شبنمِ اِحساس سے دُھلنے لگی لفظوں کی گرد
حرفِ شیریں سے چمک اُٹّھی سماعت کی جبیں

شوخیِ گفتار حافظ کی غزل کے آس پاس
ناصحانہ گفتگو، انشائے سعدی سے قریں

حوصلوں نے روشنی پائی اندھیری رات سے
کروٹیں لینے لگی شانوں پہ زلفِ عنبریں

آج اس قریہ میں آنکلا ہوں اک مدّت کے بعد
ایسا لگتا ہے کہ شاید یہ وہ قریہ ہی نہیں

اُس کے پہلو میں، گلی تھی دل کشا و دل نواز
اُس کی قربت میں کھنڈر تھا دل پذیر و دل نشیں

اُس کی نسبت سے تھیں اس بستی کی ساری رونقیں
اب اُسے لے جاؤں ماضی کی طرف، ممکن نہیں

دُور تک ہُو مارتا صحرائے جاں ہے اور مَیں
میرے ماضی کا طلسمِ ہفت خواں ہے اور مَیں

رخصت اے زنداں جنوں ہے آج پھر رہنِ خیال
میرے ماضی کے تعاقب میں چلا ہے میرا حال

دل کے ویرانوں میں یادوں کے کھنڈر پھیلے ہوئے
جن پہ مٹی کی طرح جمتے رہے ہیں ماہ و سال

حافظہ کے کُنج میں بجتی ہوئی شہنائیاں
وقت کے ماتھے پہ تھرّائی ہوئی صبحِ وصال

حافظہ پر کتنی تاریخوں کے منظر ثبت ہیں
مُرتَسِم ہے کتنی تہذیبوں کا نقشِ لازوال

کتنے غاروں کا اندھیرا کتنے تاروں کی چمک
کتنی کلیوں کی تواضع کتنے پھولوں کا جلال

کتنی یادوں کے جزیرے کتنے دریاؤں کے خم
کتنی بانہوں کی کمانیں کتنے ہونٹوں کے ہلال

وہ ندی کے موڑ پر کچّے مکانوں کے قریب
اک حویلی جس سے وابستہ مرے بچپن کا حال

دوپہر کی چلچلاتی دھوپ، چرواہوں کے گیت
گوپیاں دیتی ہوں جیسے بانسری کی لَے پہ تال

گو اسے چھوڑے ہوئے مدّت ہوئی مجھ کو مگر
اُس کی یادوں کی جراحت ہے حریفِ اندمال

اِس جراحت سے سوا وہ آگہی کا زخم ہے
جس کے بھر جانے کی ہر خواہش ہے اک امرِ محال

دانشِ جہل آفریں کی اس اندھیری رات میں
گھومتے پھرتے ہیں غُرّاتے ہوئے گُرگ و شِغال

خواہشِ قلبِ مفکر کیا ہے تکذیب علوم
ہر حقیقت کے جلو میں بے حقیقت قیل و قال

گردشِ کلکِ مصنف کیا ہے رقصِ عنکبوت
جب مگس کے گرد بُنتی جا رہی ہو اپنا جال

جہل کی جھولی میں یہ ارض و سما ہیں اور میں
جذبہ و ادراک خنجر آزما ہیں اور میں

میں کہ اک انساں زروئے عقل و ادراک و صفات
اپنے پیکر میں لئے آدم کی میراثِ حیات

نارسیدہ فکر گُم گشتہ کبوتر کی اڑان
دل گزیدہ عقل اس پرواز پر شاہیں کی گھات

دانۂ گندم کی تاویلوں میں اُلجھایا ہوا
قربتِ حوّا کا سودا خواہشِ تکمیلِ ذات

نارسیدہ ہر کلی اک پھول کی تمہید ہے
کم سنی ہی بڑھ کے دیتی ہے جوانی کو ثبات

رکھ کے اک سجدہ کا نذرانہ کسی دہلیز پر
عمر بھر کی جیت بن جاتی ہے اک لمحہ کی مات

آہ وہ اِک لمحۂ آوارہ کی دریا دلی
جب کہ حاصل تھا کسی چہرے کا پورا التفات

جس کی سانسوں کا تموّج بادبانوں کا حریف
جس کے ہونٹوں کا تموّل دلبری کی کائنات

دلبری لیکن فروغِ شعلۂ خس یک نفس
اور ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کے مشکلات

آہ یہ وقت و مکاں کے گنبدِ بے در کی قید
درحقیقت اک جہت ہے اور بظاہر شش جہات

سُن! کہ ناقوں کے گلوں کی گھنٹیاں بجنے لگیں
دیکھ ہَودَج لے چلے حال وگزشتہ کی برات

بے ارادہ خارزاروں کا سفر ہے اور میں
دین و دانش کی یہ بوڑھی رہ گزر ہے اور میں

پت جھڑ

برسوں پہلے
اک دن اُس کی گھنٹی پر
میں نے فقط گھر کا دروازہ کھولا تھا
دل کے سارے دروازے تو خود ہی کُھلے تھے

برسوں بعد
فُسوں آثار، سجیلی موٹروے سے اُتر کر
پوٹھوہار کی
اُونچی نیچی کچّی ناہموار سڑک پر
ہچکولے کھاتی گاڑی میں

اسٹیرنگ کے پیچھے بیٹھا
جانے کب سے سوچ رہا تھا
کیوں کر اُس سے باتوں کا آغاز کروں گا

پھر خود ہی آغاز ہوا
''ایسی رات ایسے موسم میں
آپ نے کیسے زحمت کی؟''
تم کو دیکھے شاید صدیاں بیت گئی تھیں
تم کو دیکھنے آیا تھا

•

برسوں بعد یہ جملہ سُن کر
اُن ساون آنکھوں میں ایسا پت جھڑ تھا
فصلِ بہار کے سارے پتّے
آنسو بن کر ٹوٹ گئے

O

اَبد کا ایک بھی لمحہ، حیات میں نہ ملا
دِنوں کا نوُر چراغوں کی رات میں نہ ملا

وہ اک طلسم پسِ کائنات بھی تو نہ تھا
تلاش پر جو تری کائنات میں نہ ملا

ادا کیا تھا جسے سرخوشی نے پچھلے پہر
وہ ایک لفظ غِیاثُ اللُّغات میں نہ ملا

۳۵

مجھے مقامِ تجرّد میں رکھ کہ انساں ہوں
صفت کا زہر مری اصلِ ذات میں نہ ملا

قریب تھا تو رگِ جاں سے بھی قریب رہا
ہوا جو دُور تو پھر شش جہات میں نہ ملا

O

رہو ہمیشہ حریف بن کر ازل سے دستور ہے قضا کا
عجب مثلّث ہے اس جہاں میں چراغ و پروانہ و ہوا کا

یہ مانتے ہو کہ ہر قدم پر عزیمتیں فسخ ہورہی ہیں
اگر ارادے میں مستقل ہو تو روک لو راستہ خدا کا

گناہگاروں کو تیرا دوزخ جلا کے کندن بنا رہا ہے
تری عدالت پہ حرف کیسا سزا بھی اک روپ ہے جزا کا

وہ آئینے میں خود اپنی صورت کو دیکھ کر مسکرا رہا ہے
اسے سنا دو حکایتِ دل یہ وقت ہے عرضِ مدّعا کا

وہ اپنے گھر خوش رہے تو شاید میں اپنے ماضی میں لوٹ جاؤں
کہ میرا گھر کب سے منتظر ہے کسی مسافر کے نقشِ پا کا

میں دستِ منعم کا ایک سکّہ اگرچہ کھوٹا ہوں پھر بھی طالب
نہ جانے کب سے میں منتظر ہوں عنایتِ کاسۂ گدا کا

O

نہ تنبیہ آگہی کرتی نہ تضحیک ارتقا کرتا
میں بندر کی طرح ویران شاخوں میں رہا کرتا

زمیں کھودی تھی پانی کی طلب میں ایک پیاسے نے
پرانے وقت کے نایاب سکّوں کو وہ کیا کرتا

میں وحشی ہوں مجھے وحشت کے سنّاٹوں سے مطلب ہے
زمانہ مجھ پہ کیوں سوُد و زیاں کے باب وَا کرتا

نہادِ آشیاں سازی سے بے بس تھا بَیا ورنہ
کبوتر کی طرح ٹوٹے مکانوں میں رہا کرتا

وہ آنسو بہہ گئے، اچھا ہوا، اک بوجھ تو اترا
دلِ بے مدّعا ٹوٹے ہوئے تاروں کا کیا کرتا

سیاحت کے سبھی زخموں پہ مرہم رکھ کے بیٹھا ہوں
میں کتنی بستیوں کی دل نوازی سے وفا کرتا

میں خود اپنے ہی شہرِ جاں کا اک درویش ہوں طالب
گلی کوچوں میں پھرتا اور فقیرانہ صدا کرتا

O

پسِ طومارِ خرد جو بھی اجازہ نکلا
روئے تحقیق پہ اوہام کا غازہ نکلا

آج پھر دل پہ کسی یاد نے دستک دی ہے
مندمل سمجھے تھے جس زخم کو تازہ نکلا

آخری صف کو ابھی رَوند کے پلٹے ہی تھے ہم
کہ کمیں گاہ سے اک لشکرِ تازہ نکلا

کاٹ دی عمر گداگر کے سوالوں کی طرح
تب کہیں غیرتِ آبا کا جنازہ نکلا

ہر گلی شہر کی، انگشت بہ لب تھی طالب
کوئی بارات چلی تھی کہ جنازہ نکلا

O

بے برگ و ثمر زیست کے صحراؤں میں رہنا
یعنی کہ مقدّر کی گھنی چھاؤں میں رہنا

یہ راہبۂ فکر کدھر جائے کہ اس کو
آزار ہے لفظوں کے کلیساؤں میں رہنا

مچھلی کی طرح تو بھی مگرمچھ سے نہ رکھ بَیر
آجائے گا اک دن تجھے دریاؤں میں رہنا

اس کربِ معیشت نے مری بے وطَنی کو
سِکھلادیا چھالوں کی طرح پاؤں میں رہنا

طالب تمھیں شہروں کی ثقافت سے گلہ ہے
اب جاؤ کسی چھوٹے سے اک گاؤں میں رہنا

O

وہ کل خلوت میں خود اپنے ہی امکانات میں گم تھا
حیا چپ تھی حیا کا آئینہ محوِ تکلّم تھا

طبیعت کی سُرنگیں کھودنے والوں نے کیا پایا
کہ ہر اک گام پر ذرّوں کا لمحوں سے تصادم تھا

قبائے عقل کا ہر تار خُشکیدہ بھی ہے نَم بھی
مرے باطن کی گہرائی میں صحرا تھا کہ قلزم تھا

وہ اک بَرتا ہوا لمحہ مسیحا کی رفاقت میں
وہ لمحہ، جب دماغ اپنا سرِ چرخِ چہارم تھا

مرا اِدراک اب تک اُس کی تاویلوں میں اُلجھا ہے
وہ بے آواز فِقرہ جو پسِ موجِ تبسم تھا

میں اشیاء کی حقیقت دیکھنے نکلا تو تھا لیکن
فضا تاریک تھی ہر سو غبارِ ماہ و انجم تھا

کسی کشتی نے گردن ڈال دی گہرے سمندر میں
جبھی کچھ دیر تک ہموار موجوں میں تلاطم تھا

○

جو آدمی چلا تھا سوئے شہرِ جاں کدھر گیا
ابھی تو دل کے پاس تھا وہ ناگہاں کدھر گیا

تو کیا میں دھوپ اوڑھ لوں گلیمِ ابر پھینک کر
جو میرے سر کی چھاؤں تھا وہ سائباں کدھر گیا

میں میزباں تھا، اُس کے حق میں فرش بن کے بچھ گیا
تو پھر یہ منہ اندھیرے میرا میہماں کدھر گیا

۴۵

مرے حصارِ عقل میں گماں یقیں کے ساتھ تھا
گماں یقیں کے ساتھ تھا تو پھر گماں کدھر گیا

تو کیا اُسے میں جا کے دشمنوں میں ڈھونڈھتا پھروں
وہ دوست تھا، تو مجھ سے ہو کے سرگراں کدھر گیا

اگر تو سچ کی تاب لا سکے تو میری بات سن
پتہ نہیں، کہ میں جو تھا ابھی یہاں، کدھر گیا

O

ہر آوارہ لمحہ رین بسیرے کا
جلتا بُجھتا جگنو سانجھ سویرے کا

میں کہ اُجالے کی میّت کا وارث تھا
خِلقت پُرسہ دینے آئی اندھیرے کا

وہ مچھلی بھُوکے گھر کا مقسُوم نہ تھی
پارہ پارہ ہوگیا جال مچھیرے کا

میرا آنسو تیری آنکھ سے ٹپکا ہے
جوگی رستہ بھول گیا تھا ڈیرے کا

اُس کے کالے ہاتھ کو ڈَس کر مرگیا ناگ
مُہلِک تھا کس درجہ زہر سپیرے کا

تاریخی اشیاء کی نمائش گاہ چلو
تاج دکھاؤں تم کو ایک لٹیرے کا

O

سرِ بزمِ قضا اِس عالَمِ اسباب میں رہنا
ہمیں تو گردشِ حالات کے گرداب میں رہنا

اگر اُس خواب کو دیکھا نہ جائے تیری آنکھوں سے
تو پھر اُس خواب کا کیا دیدۂ بے خواب میں رہنا

تناور پیڑ اُکھڑ جاتے ہیں پانی کے تھپیڑوں سے
کفِ سیلاب بن کر دامنِ سیلاب میں رہنا

فلک کے چاند بتلا تو نے درویشی کہاں سیکھی
خود اپنا عکس بن کر رات بھر تالاب میں رہنا

نگاہو تم کو اُس کافر کی انگڑائی پسند آئی
تو اَب تا زیست اس کے جسم کی محراب میں رہنا

نگاہوں کو طلب تھی مستقل جائے سکونت کی
سُو راس آیا انہیں بھی عمر بھر پنجاب میں رہنا

ثقافت کے خَلا میں زندگی دشوار ہے طالب
جو دل ٹوٹے تو جا کر حلقۂ احباب میں رہنا

O

دوستوں کے دوست بن کر دشمنوں سے پیار کرنا
پہلے گھر تعمیر کرنا، پھر اُسے مسمار کرنا

اپنی خلوت میں دَر آنا، اپنی حیرت کی طلب میں
بیشۂ خالی میں گُھس کر شیر کو بیدار کرنا

عرضِ مطلب پر سیاسی مصلحت سے کام لینا
قہقہوں کی ڈھال اٹھا کر سسکیوں سے وار کرنا

وہ سیاست داں ہے شاید اس کی عادت ہی یہی ہے
ناسزا ہر بار کہنا معذرت ہر بار کرنا

تاج و طاقت کے فسوں کو قیدیوں نے توڑ ڈالا
آج تو خود کو سمیٹو پھر کبھی دربار کرنا

وہ دمشقِ بے اماں میں اپنی مظلومی کے تیور
کوئی سیکھے بھی تو ہم سے لفظ کو تلوار کرنا

ہاتھیوں کے پاؤں سے میں کس قدر روندا گیا ہوں
میری عادت بن گیا تھا، چیونٹیوں پر وار کرنا

اس نبردِ جاں میں تیری ذات ہی تیری عدو ہے
تیغ اٹھا کر پہلے اپنے آپ پر یلغار کرنا

ریت کے ٹیلوں کے پیچھے چھپ گئے خانہ بدوشاں
کب رُکی ہے موجِ دریا اس پہ کیا اصرار کرنا

لے کے اپنے ڈھور ڈنگر دشت میں گُم ہوگئی وہ
بے وفا ہرنی کے رَم پر خود کو کیا بیزار کرنا

۵۲

ہم مدینے سے نکل کر ماوراء النّہر پہنچے
اس قدر آساں نہیں تھا جوئے خوں کو پار کرنا

ماوراء النّہر سے پھر ہند کے دشت و جبل تک
دیکھ اے روح تمدّن دشت کو گلزار کرنا

O

دامنِ کوہ کی ایک شب تھی، سر پہ تاروں بھرا آسماں تھا
میں ترے پاس بیٹھا تھا لیکن، سچ بتا اُس گھڑی تو کہاں تھا

بڑھ رہا تھا سمندر کا پانی، ڈوبتے جا رہے تھے جزیرے
ناریل کے درختوں کے پیچھے، دلبری کا سفینہ رواں تھا

آفرینش کے ویران تھل میں، چلتے چلتے قدم تھک چکے تھے
تھک کے بیٹھے تو کچھ فاصلے پر، ایک بستی کا اٹھتا دھواں تھا

تجھ کو میری قسم میرے بھائی، اُس کنویں پر کبھی پھر نہ جانا
جس میں یوسف کو پھینکا گیا تھا، یہ وہی راستے کا کنواں تھا

میں مُنڈیروں کی شمعیں بُجھا کر، بند کرلوں کِواڑ اپنے گھر کے
اُس کو آنا تھا لیکن نہ آیا، شاید آنے میں کوئی زیاں تھا

دوُر گہرے سمندر میں سورج، ڈوبتا جارہا تھا کہ میں نے
یک بیک خود کو پایا اکیلا، یعنی میں کس قدر رائیگاں تھا

شہر کے گھاٹ پر منتظر تھیں، بے زبانوں کی پیاسی زبانیں
مِصر کا اک مسافر اکیلا، شہرِ مَدیَن کی جانب رواں تھا

O

چاند تک اُڑ کر پہنچنے کا نہیں اِمکان جا
اے چکوری ! اپنے گھر والوں کا کہنا مان جا

سر اُٹھا کر دیکھ منڈلانے لگا چڑیوں کا غول
اپنی چھت پر ڈال دے دو چار مُٹھّی دَھان، جا

میری غزلیں سُن کے آخر ہوگیا تو بھی اُداس
کب کہا تھا میں نے، میرا مدّعا پہچان جا

الوداعی شام کے رَم خوردہ آہُو کوُچ کر
دن کے رہتے پار کرنا ہے تجھے میدان، جا

ڈھل گیا دن اور لمبے ہوگئے پیڑوں کے سائے
تک رہا ہے کب سے تیری راہ گاڑی بان، جا

جھاڑیوں میں چُھپ گیا ہوگا کہیں زخمی شکار
دن ابھی باقی ہے تو ان جنگلوں کو چھان جا

لوگ کہتے ہیں مزاروں پر بر آتی ہے مراد
اے دلِ تنہا، کراچی چھوڑ اور ملتان جا

O

شامِ غم میں آسمانوں کو ہنسی آئی تو کیا
وہ برَس کر جاچکا اب برق لہرائی تو کیا

چل دیا جب وہ تعلُّق کی طنابیں توڑ کر
ہم نے اُس سے اب نہ ملنے کی قَسَم کھائی تو کیا

رہ گئے سارے ہی موسم کشتیوں کے پُل کے پار
اِس کنارے پر کوئی فصلِ بہار آئی تو کیا

بے مُروّت جنگلوں سے مور ہجرت کرگیا
مورنی کو اب ہوا احساسِ تنہائی تو کیا

خاک اڑانا تَھر کی قسمت ہے سُن اُے کالی گھٹا
بارشیں اُتریں تو کیا ساوَن کی رُت آئی تو کیا

آج پیاسے لوگ اس نابارشی کی فصل میں
ناپنے نکلے بھی تالابوں کی گہرائی تو کیا

یاد آتا ہے پسِ در چوڑیاں کھنکی تو تھیں
شامِ فرقت ہی نہ اس نغمے کو سُن پائی تو کیا

O

ہر نفَس حیرت کدہ ہے معنیٔ تحریر کا
نقشِ قسمت دوسرا رُخ ہے تری تصویر کا

منتقل ہو جائے جس سے شعر میں جذبوں کا سچ
ڈھونڈھنا اُس حرف کا لانا ہے جوئے شیر کا

ناتواں ٹھہرے، تو امن و عافیت کے نام پر
مصلحت سے کام لے لیتے ہیں ہم شمشیر کا

اُس نے آخر کیوں سمجھ کر بھی نہ سمجھی میری بات
اتنا منفی تو نہ تھا لہجہ مری تقریر کا

شعلۂ گُل کے تصوّر سے قَفَس میں جل گیا
وہ جو اک رشتہ تھا میرے پاؤں سے زنجیر کا

دل وہ حرفِ بے ہُنر ہے جذبۂ تحریر کا
خون ہو تو رنگ بن جائے کسی تصویر کا

جانے یہ سیلاب کن نام آوروں کو کھا گیا
جانے کیا شجرہ ہے اس بہتے ہوئے شہتیر کا

میری غدّاری مرے حق میں بشارت بن گئی
چُغلیاں کھائیں تو پروانہ ملا جاگیر کا

O

اُس کا ہر انداز سجیلا بانکا تھا
کچھ تو بتاؤ وہ خوش پوش کہاں کا تھا

ایک طرف سے کُھلی ہوئی تھی شیر کی راہ
لیکن اس پر تین طرف سے ہانکا تھا

مت گھبرانا دوست، غبارِ ناقہ سے
ہم نے بھی اس دھول کو برسوں پھانکا تھا

جس کی لاش پڑی ہوئی تھی گھوڑے پر
وہ نوزائیدہ بچّہ کس ماں کا تھا

شہر مخالف تھا، جب اُس کے دامن سے
میرے جنوں نے اپنا گریباں ٹانکا تھا

اُس کو پہنچانے جب اُس کے گاؤں گئے
گاڑی کے بَیلوں کو ہم نے ہانکا تھا

اُس کے گھر سے نکل کر ہم نے شام ڈھلے
کچھ نہیں یاد کہ کتنے گھروں میں جھانکا تھا

روزِ حشر کا ڈر کیسا جب دنیا میں
اُس نے ہر ہر عیب کو میرے ڈھانکا تھا

O

جا، اپنی بسائی ہوئی دنیا میں پلٹ جا
یا پھر مرے احساس کی تلوار سے کٹ جا

اے دورِ پُر آشوب کے بکھرے ہوئے انساں
ممکن ہو تو پھر اپنے ہی پیکر میں سمٹ جا

جب بھوت ڈرائیں تجھے تاریکیٔ شب میں
جینا ہے تو بڑھ کر اُنہیں بھوتوں سے لپٹ جا

اب آیا ہے ملنے مری خاکسترِ جاں سے
گزرے ہوئے ایّام کے اوراق پلٹ، جا

ہاں سچ ہے کہ تیرے لئے جیتا تھا کبھی میں
ہر بار فقط ایک ہی جملے کو نہ رٹ، جا

راس آئی ہے کب منزلِ تکمیل کسی کو
اے چاند یہی امر مناسب ہے کہ گھٹ جا

تو قرضِ ابد ہے تو خزانوں میں پڑا رہ
تو نقدِ تمنا ہے تو خیرات میں بٹ جا

کانوں پہ بہت بار ہے یکسانی اشعار
طالب یہی بہتر ہے کہ اب بزم سے ہٹ جا

○

اب میں کس کس کو یہ بتلاؤں کہ کیا کیا ڈوبا
گھاٹ سے ناؤ چلی تھی کہ کنارا ڈوبا

لوگ تو ساحلِ فطرت کے تماشائی تھے
اس سمندر میں تو بس میں ہی اکیلا ڈوبا

ہر بُنِ مُو سے کرن پھوٹ رہی تھی کل شب
دن جو نکلا تو اندھیرے میں سراپا ڈوبا

کس سے بجھ سکتی بھلا میرے سوا نہر کی پیاس
ہاں یہ سچ ہے کہ سرِ نہر میں پیاسا ڈوبا

ساحلی گاؤں کے تیراک بھی حیران رہے
دوست تو ساتھ تھے پھر کیسے وہ تنہا ڈوبا

کشتیِ نوح سے منہ موڑ کے جانے والو
نوح نے جس کو پکارا تھا وہ بیٹا ڈوبا

اک ذرا رُک تو سہی پار اُترنے والی
تو وہ اک موج کہ جس موج میں دریا ڈوبا

O

محفلِ یاراں میں بیٹھا ہنستا لڑکا
خوش خُو خوش گفتار مگر تنہا لڑکا

موجوں کے ہلکوروں میں بہتے پتّے
پہروں بیٹھ کے دیکھا کرتا تھا لڑکا

اپنے بڑے ہونے کا جب احساس ہوا
اُس دوپہر میں کیسا گھبرایا لڑکا

اِس دنیا کی ساری گِنتی سیکھ گیا
وقت کے سرکش لمحوں کو گِنتا لڑکا

لے گئی فکرِ معاش سمندر پار اُسے
برسوں بعد جب اپنے گھر پلٹا لڑکا

گاؤں کے اک بازار میں پیلے ہاتھوں کو
دیکھ کے کس بے تابی سے چونکا لڑکا

بند دریچے مُہر بہ لب تھے گلیوں میں
اُن سے پوچھ رہا تھا کوئی پتا لڑکا

یادوں کی الماری کھولے بیٹھا تھا
ایک اندھیرے کمرے میں بوڑھا لڑکا

O

وہ بوڑھا بھی کتنا دلکش بوڑھا تھا
یادوں کی دہلیز پہ چُپکا بیٹھا تھا

شور مچاتے آنسو ٹپ ٹپ گرتے تھے
ہونٹوں پر اک ٹھہرا زدہ سناٹا تھا

ایک طرف پھَن کاڑھے بیٹھی تھی راتیں
ایک طرف پرشور دِنوں کا میلا تھا

ٹوٹے پھوٹے چند کھلونوں کے ہمراہ
اک گوشے میں اس کا بچپن رکھا تھا

ہر شوخی پر ہر معصوم شرارت پر
ماں کے پاکیزہ آنچل کا سایا تھا

کتنے آنچل اس کے لئے لہرائے تھے
کتنے رُخوں نے اس پہ کرم فرمایا تھا

کیسے کیسے دوست سجیلے بانکے تھے
کیا کیا اُن کے ساتھ میں گھومنا پھرنا تھا

پھر ماں کے اصرار پہ اک دن رات ڈھلے
اُس کے شبستاں میں کوئی دَر آیا تھا

اُس کو بوڑھا ہوتے دیکھ کے بھاگ گیا
اس کے اندر چھپا ہوا جو لڑکا تھا

○

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
ہمیں یوسف کا سفر یاد آیا

میں نے تلوار پہ سر رکھا تھا
یعنی تلوار سے سر یاد آیا

وہ تری کم سُخنی تھی کہ مجھے
بات کرنے کا ہُنر یاد آیا

اے زمانے مرے پہلو میں ٹھہر
پھر سلامِ پسِ در یاد آیا

کسے اڑتے ہوئے دیکھا کہ تمھیں
اپنا ٹوٹا ہوا پر یاد آیا

آج میں خود سے مِلا ہوں طالب
آج بھولا ہوا گھر یاد آیا

تشکیک

یہ گردشوں کے قافلے　　یہ موسموں کے سلسلے
یہ چاہتوں کے حوصلے　　یہ نفرتوں کے زلزلے
جوشِ نمو کے مرحلے　　تازہ لہو کے ولولے
پائے خرد کے آبلے

چھایا ہوا ہر سُو فسوں　　فطرت حریف ہر سکوں
چاروں طرف سیلابِ خوں　　احساس اک صید زبوں
ادراک اِک حرفِ جنوں

احساس جذبوں کی تھکن　　　ادراک فطرت کی چبھن
ایمان اَبلہ کا وطن　　　الحاد احمق کا چمن
تقدیر مفلس کا کفن　　　تدبیر منعم کا چلن

یزداں حریفِ اہرمن

ابلیس کے سر کی قسم　　　ہر لا میں ہے موجِ نعم
پردہ ہیں یہ دیر و حرم　　　دھوکہ ہیں یہ سیف و قلم
جھوٹے ہیں سب جود و کرم　　　کھوٹے ہیں سب دام و درم

مایا ہیں سارے کیف و کم

سارے علومِ مادّہ　　　سمع و بَصَر کا تجربہ
سارا کلام و فلسفہ　　　عقل و خِرَد کا شُعبدہ

علم بشر اک واہمہ

سارا کرشمہ دہر کا　　　بے ربطیوں کا ماجرا
مانگی دعا پائی سزا　　　بویا مکاں کاٹی خلا

کھودا صنم نکلا خدا

ہر کارواں خود ساختہ　　　ہر عاطفہ جاں باختہ

ہر واہمہ ناساختہ ہر باز نا پرداختہ

بے عافیت ہر فاختہ

اے عقلِ آدم کے خلل مت ڈھونڈھ اسباب و علل

کیا زندگی کیسی اجل ہر شے ہے اک ضرب المثل

حسبِ مکافاتِ عمل پانا ہے جب کرنی کا پھل

حَیَّ علےٰ خیرِ العمل

مصلحت

یہ وجودِ بیکراں کس قدر بخیل ہے
زندگی کی ہر عطا بخل کی دلیل ہے

ایک حس کی بے حسی دوسری کا فَہم ہے
ذائقہ کا ہر مزہ باَصِرہ کا وہم ہے

آنکھ کا مشاہدہ عقل کی کراہ ہے
سامعہ کا ہر یقیں سر کا اشتباہ ہے
شامّہ کا تجربہ لمس کا گناہ ہے

بے حدی کی ہر عطا اپنی اپنی حد میں ہے
آدمی کی ہر جہت مصلحت کی زد میں ہے

فریب خوردہ شاہیں

رات تھی اور کہکشاں در کہکشاں تھی
بازوؤں میں دم تھا اور ہمّت جواں تھی

چرخ کی مٹّی پہ روئیدہ ستارے
کر رہے تھے دوُر سے مجھ کو اشارے

اک بُلاوا تھا ستاروں کی چمک میں
اک طلسم افزا کشش تھی آسماں میں
یوں نئی دنیاؤں کی دریافت کی دُھن
لے اُڑی مجھ کو فضائے بیکراں میں

آسماں پر چاندنی کی ریت دیکھی
اور زمیں پر روشنی کے کھیت دیکھے

میں مسلسل رات بھر اُڑتا رہا ہوں
اِس خلا میں ٹوٹتا جُڑتا رہا ہوں
دن نکل آیا ہے شہپر تھک گئے ہیں

یہ فضا کا بے شجر سُنسان صحرا
چار سُو ہُو مارتا ویران صحرا

کوئی کوہِ خُشک کوئی کاہِ لرزاں
کوئی جنگل کوئی بَن کوئی نَیستاں
کوئی ٹیلہ کوئی متروک آشیانہ
کوئی فرسودہ مُنڈیر اور اس کا سایہ
کوئی شاخِ سدرہ، کوئی کاخِ کُہنہ
کچھ تو ہو جس پر گھڑی بھر سانس لے لوں

کس قدر بنجر ہے یہ میداں فضا کا
کتنا غیر آباد ہے یہ دشتِ امکاں

رُک چکی ہے سانس جذبے بے اثر ہیں
شل ہیں بازو حوصلے اَفسردہ تر ہیں

میں کہ اپنی ہار کا منکِر رہا ہوں
اس فضا سے پر سمیٹے گِر رہا ہوں

بادلوں کی روئی اڑتی پھر رہی ہے
برف میرے شہپروں پر گر رہی ہے

سو تم نے دیکھا

یہ میری بستی
تہہِ زمیں کی سیاہ وشب تاب ظلمتوں میں
مرے لئے اور مرے بنی نوع کے لئے
عافیت کا گوشہ

زمیں کے نیچے
یہ میرا چھوٹا سا شہر
اک دائمی حقیقت کا ترجماں ہے
کہ جو بھی اپنا خمیرِ جاں ہے
اسی خمیرِ وجود میں اجتماعیت اور مُعاشرت
بھی گُندھی ہوئی ہے

زمانۂ قحط کے لئے میرے ساتھیوں نے
بڑی لگن اور کڑی مشقّت سے دانہ دانہ کیا اکٹھا

ہم اس ذخیرے کے دانے دانے کو دو کریں گے
کہ خاک کا نَم انہیں دوبارہ نُمو نہ دیدے
کہ وہ ذخیرہ ہماری خوراک بن نہ پائے

سو تم نے دیکھا
کہ فکر حاضر کے ساتھ ہم میں شعور آئندہ کس قدر ہے
یہ سعی و کوشش یہ جدّ و کد جو ہماری ہستی کا لازمہ ہے
تمہاری اس رنگ و بو کی دنیا میں واہمہ ہے
اگر کوئی کام اپنی طاقت سے ہو فزوں تر
ہم اس کو اپنی بقا کا چیلنج جانتے ہیں

ہماری وادی میں جب سلیمان اپنے لشکر کے ساتھ آئے
تو میں نے سب چیونٹیوں کو آواز دی کہ جاؤ
پناہ لو اپنے اپنے گھر میں
کہ یہ مَبادا تمہیں کچلتے گزر نہ جائیں
اور اُن کو اُس کا شعور و اِدراک بھی نہ ہوگا

اگرچہ اس بات پر سلیمان ہنس دیئے تھے
(نبوتوں میں کسی طرح کی بھی بے شعوری کا
لاحقہ غیر منطقی ہے)

سو تم نے دیکھا
کہ میرے ابنائے نوع سارے
شعور کی نعمتوں سے کس درجہ بَہرہ وَر ہیں
کہ ہم بیان و پیام و ابلاغ کے سلیقوں سے
باخبر ہیں

سو تم نے دیکھا
ہمارے جتنے بھی ہیں مسائل
اُنھیں اکیلے
ہماری فطرت نے حل کیا ہے
مگر یہ نافہم و نامُراد آدمی ابھی تک تُلا ہوا ہے
کہ علم کے زور پر مسائل کو حل کرے گا

وہ حل کہ پھر جس کے بطن سے اَن گنت مسائل
نمو کریں گے
اگر علوم جہالت آ ثار ہی مسائل کا اصلِ حل ہیں
تو پھر بتاؤ

کہ بزم عالَم کی یہ کہانی ہے اک پہیلی بڑی پُرانی
بڑے مفکر بڑے گیانی گزر گئے ہو کے آنجہانی
فلاسفہ نے بھی خاک چھانی نہ اس کا اوّل نہ اس کا ثانی
فضائے عالم کی بیکرانی نہ لازمانی نہ لامکانی

تو پھر وہ کیا ہے جو ابتدا ہے
تو پھر وہ کب ہے جو انتہا ہے

یہ مسئلہ بھی بہت اہم ہے
کہ حال کے ناشناس لمحے گئے دنوں کے اُداس لمحے
دریدہ و بے لباس لمحے شکستہ و بدحواس لمحے

یہ کیا ہیں اور ان کا کیا بھرم ہے
کہ ان کی حد کیف ہے نہ کم ہے

حیات اگر صرف خیر ٹھہرے

زمیں پہ شر کا پڑاؤ کیا ہے　　زیاں کا سودے پہ داؤ کیا ہے
فنا کا ہستی پہ گھاؤ کیا ہے　　یم عدم کا بہاؤ کیا ہے
ثواب و طاعت کا بھاؤ کیا ہے　　ہے کون مانجھی یہ ناؤ کیا ہے
بناؤ میں یہ بگاڑ کیوں ہے　　بگاڑ میں یہ بناؤ کیا ہے

کہ شر جو ہستی کا غیر ٹھہرے
کہاں پہ فطرت کا پیر ٹھہرے

یہ بات بھی تم کو سوچنی ہے

عمل پہ ہے گر قضا کا پہرا　　کہو کہ انساں کہاں پہ ٹھہرا
بشر ہے پھر کس قدر اکہرا　　نہ کچھ روپہلا نہ کچھ سنہرا
ہر ایک گونگا ہر ایک بہرا　　یہ زخم ہے کچھ زیادہ گہرا

دماغ و دل میں شکستگی ہے
ہر ایک پل قیدِ بے بسی ہے

تمہاری دانش کا وہ خزانہ

کہ جس کا تکیہ ہو جانے پر　　جو منتہی ہو مشاہدے پر

جو جا کے رک جائے تجربے پر کسی بدیہی سے قاعدے پر
اسی پہ رکھنا بنائے خانہ
وہی ہے حکمت کا آشیانہ
مگر یہ پنہاں نہ ہو نظر سے
کہ لاکھ دانش کا ابر برسے ہزار نکتے ہوں جلوہ گر سے
وہ علم خالی ہے ہر ہنر سے جو لڑ پڑے فطرتِ بشر سے
صدف کی پیکار ہے گُہر سے
دعا کا انکار ہے اثر سے
یہ رمزِ اوّل ہے آگہی کا
جو عقل و فطرت میں ہو تصادم علوم بنتے ہیں مار و کژدُم
خود اپنی فطرت میں ڈوب کر تم کھنگال ڈالو درونِ قلزم
کھلے گا جب باب خود رسی کا
سحاب برسے گا روشنی کا

O

جب کسی کو بسترِ محنت پہ آجاتی ہے نیند
تیرگی کو روشنی کے خواب دکھلاتی ہے نیند

درد کے بے خواب سنّاٹوں سے گھبراتی ہے نیند
اور کبھی پھانسی کے تختے پر بھی آجاتی ہے نیند

ہم چراغِ شامِ ہجرت ہیں ہمیں جلنے تو دے
رات، کیوں ان بے وطن آنکھوں پر برساتی ہے نیند

خواب میں اک جل پری ہوتی ہے مجھ سے ہم کلام
گو حقیقت ہے مگر کتنی طلسماتی ہے نیند

چھُپ تو جاتے ہیں گھنیری جھاڑیوں کی اوٹ میں
رات ہوتے ہی درندوں کو بھی کھا جاتی ہے نیند

گھونسلوں میں لوریاں گاتے ہیں جب چڑیوں کے غول
جنگلوں کی شام میں شاخوں پہ منڈلاتی ہے نیند

جاگتا رہتا ہوں طالب میں شبِ مہتاب میں
اور میری گود میں سر رکھ کے سو جاتی ہے نیند

○

حقیقت کی طلب کا ہر مسافر
شکستہ پا، خمیدہ سر مسافر

تو اپنی راہ خود تخلیق کر لے
ہٹاتا جا ہر اک پتھر مسافر

زمیں پر رات اُترتی آ رہی ہے
اُتار اب دوش سے بستر مسافر

دیارِ دل کے پیڑوں کو نہ کاٹو
اُترتے ہیں یہاں اکثر مسافر

سفر سب سے بڑا آزارِ جاں ہے
بنالے تو بھی کوئی گھر مسافر

ترے چہرے پہ یہ بے رونقی کیوں
لگی ہے چوٹ کیا دل پر مسافر

کہاں ٹھہریں کسے جی بھر کے دیکھیں
ہر اک لمحہ ہر اک منظر مسافر

○

ناز کرتا تھا بہت وہ گھر کے اطمینان پر
صبح جب جاگا تو تہمت لگ گئی مہمان پر

حرص کی نظروں میں نانِ چرب و نانِ خشک کیا
کچھ بھی رکھو، مکھّیاں آئیں گی دسترخوان پر

اپنے خود آزار چرواہے کے غم سے بے نیاز
کس قدر خوش ہیں اُچھلتی بکریاں ڈھلوان پر

اب تو شریانوں میں سردی سے لہو جمنے لگا
آج بھی تکیہ کیئے بیٹھے ہو آتشدان پر

جس دلِ تنہا میں برسوں سے کوئی رہتا نہ ہو
کون دستک دے بھلا اُس خانۂ ویران پر

مُحسِنوں کی آنکھ سے کاجل چُرالیتے ہیں لوگ
سوچتے کیا ہو، نظر رکھّا کرو سامان پر

نِت نئے دلکش کھلونے دیکھ کر بچوں کے پاس
ایک بچّہ اپنا بستہ رکھ گیا دوکان پر

پھر بجی ہے میرے ہی اندر کہیں زنجیرِ عدل
ظلم پھر مجھ سے ہوا، مجھ میں نہاں انسان پر

غالبًا اب اُس کے گھر والوں سے ملنا تھا فضول
در پہ دستک دی تو آنچ آنے لگی دالان پر

O

اپنی سرکش اُڑانوں پہ قابو کرو اب کمندیں نہ ڈالو خور و ماہ پر
کون جانے کہاں تک اڑاتے پھریں تم کو یہ حیلہ پرداز و بدخواہ پر

کس نے قول وقسم کو نبایا یہاں وقت بدلا تو ہم بھی بدل جائیں گے
سچ کو سننے کی عادت نہ ڈالی اگر کان دھرتے پھرو گے تم افواہ پر

آگ اور خون کے عالمی کھیل پر عصرِ حاضر کے دانشورو کچھ کہو
اب تو مجرم خموشی سے توبہ کرو حرف آنے لگا نطقِ آگاہ پر

عقل و جذبات کی اس کُھلی جنگ میں جیت اور ہار کا فیصلہ سخت ہے
لشکری حملہ ور ہو نہ جائیں کہیں اپنی ہی سلطنت کے شہنشاہ پر

کتنے ویرانے طے کر کے آیا ہوں میں بھکشوؤں کی یہ کہنہ سرا دیکھنے
یہ عمارت بنائی گئی تھی کبھی مشرقی قافلوں کی گزرگاہ پر

جس کی کرنوں سے روشن ہے میرا کُرہ وہ ستارہ تو کب کا فنا ہو چکا
یہ مسافت کی ماری ہوئی روشنی آ گری اس کُرے کی رَصد گاہ پر

تم کہ اک بے رُخی کے گلہ مند ہو ہم سے پوچھو کہ ہم ہیں سراپا گلہ
اہلِ دنیا بہت ہی دغاباز ہیں اب بھروسہ کرو اپنے اللہ پر

اک ذرا آنکھ لگنے دو چوپان کی سب مویشی یہاں سے نکل جائیں گے
یہ بچارے کہاں تک گزارا کریں پچھلی صدیوں کی سوکھی چراگاہ پر

○

دشمنِ جاں ہے یہ ہیبت ناک ویرانہ گزر
اے قلندر اِس زمیں سے بے نیازانہ گزر

چشم و لب کی بھیک لینی ہے تو میرے ساتھ چل
بَن گداگر اور اِن گلیوں سے شاہانہ گزر

عِطر کے سوداگروں پر بھی کُھلے خوشبوٗ کا راز
اے سراپا عطر اُس کوچہ سے بیگانہ گزر

تو سلامت ہے تو اک دن راستہ بن جائے گا
اے مسافر اِن بیابانوں سے روزانہ گزر

یہ زمانہ تجھ پہ گزرا ہے سفیہوں کی طرح
تو مگر طالب زمانے سے حکیمانہ گزر

O

جھپٹ کے جب گرا عقاب اپنے اک شکار پر
ہواؤں سے اُلجھ پڑے بکھر کے بے شمار پر

ببُول کے درخت کو اُداسیوں سے کیا ملا
پرندے اُڑکے جابسے صَنوبر و چنار پر

اَجل تو ہی بتا وہ شخص اپنی موت کب مرے
جو دوسروں کی موت مررہا ہو چوبِ دار پر

وہ شاخِ مصلحت کی اک کلی سے مات کھا گیا
جو آج بھی کھلا ہوا ہے شاخِ انتظار پر

چُکادیا خزاں کی ایک زرد شام نے اُسے
مری اُداسیوں کا جو بھی قرض تھا بہار پر

○

سوادِ شام، سناٹا، سمندر
میں اپنی ذات میں تنہا سمندر

مری تقدیر کشتی یا کجاوہ
مرے احباب صحرا یا سمندر

سُنا کرتا ہے جل پریوں کے نغمے
شبِ مہتاب میں گہرا سمندر

طلسمِ کوہساراں کے اسیرو
ابھی تم نے کہاں دیکھا سمندر

وہ اپنے جھاگ کو مُتھنے لگا ہے
نہ جانے کیا بنائے گا سمندر

شکستہ کشتیوں سے کھیلتا ہے
کھلونے کھیلنے والا سمندر

مجھے تو آبشاروں کی طلب تھی
مرا مقسوم ہے ٹھہرا سمندر

ہاں مجھے جانا ہے نادیدہ جہانوں کی طرف
اے ستارو ! لوٹ جاؤ آسمانوں کی طرف

اب کہ کشتی خود ہی آ پہنچی ہے بندرگاہ پر
اب ہوائیں آ رہی ہیں بادبانوں کی طرف

اڑنے والے جن پروں پر خستگی کی گرد ہے
اُن کا رخ ہے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف

اس گھنے جنگل میں شاید شام اُترنے ہی کو ہے
جانور بھی چل دیۓ اپنے ٹھکانوں کی طرف

اب مناؤ خیر ہاتھی دانت کے سوداگرو
ہاتھیوں کا غول پلٹا ہے مچانوں کی طرف

عقل کہتی ہے گمانوں سے یقینوں کو نچوڑ
دل کی ضد ہے بڑھ یقینوں سے گمانوں کی طرف

حرمتِ پرواز کی مجبوریاں درپیش ہیں
ورنہ کب گُنجِشک مائل تھی اڑانوں کی طرف

پھر کوئی چہرہ ہوا روشن سرِ بامِ خیال
پھر مجھے مڑنا ہے گم گشتہ زمانوں کی طرف

دوستی کی پاسداری کر تعلق کو نہ توڑ
مہرباں روٹھیں تو جا نامہربانوں کی طرف

O

ساری تگ و دَو ہے آدمی کی بس سُود و زیان و بیش و کم تک
بازارِ جہاں میں پھر کے دیکھو بِک جاتے ہیں نطق اور قلم تک

اِیمائے فسونِ گُنجِ لب سے صحرائے طلسمِ چشمِ نم تک
آغاز تھا اِس سفر کا تُم سے انجام ہے اِس سفر کا ہم تک

پہرے ہوں جہاں معاشرت کے وعدہ پہ ہو اعتبار کیسے
اِصرار کی شدّتوں سے دب کر آنا پڑا قول کو قسم تک

اُس چاند کو دیکھ کر اچانک روتا رہا میں خوشی کے آنسو
یہ کس نے کہا کہ اس زمیں پر خوشیوں کی پہنچ نہیں ہے غم تک

اب کس کو سخنوری کا دعویٰ اب کیسا غرورِ خوش بیانی
ہم اُس سے کوئی سوال کر کے کھو آئے ہیں لفظ کا بھرم تک

ماضی کی وہ ناسپاس گلیاں منہ ڈھانپ کے سو گئی ہوں شاید
لیکن مرے حافظہ میں اب بھی بیدار ہیں اُن کے پیچ و خم تک

O

پہنچی دلوں کی آگ ہمارے خیام تک
لیکن دھواں تو جائے گا دربارِ شام تک

کس نام کے طلسم میں گُم ہوگئے وہ لوگ
یعنی وہ لوگ بھول گئے اپنا نام تک

کیسا شکار کس کے شکاری کہ اے عزیز
ہر شے یہاں فریب ہے دانے سے دام تک

غصہ خدا پہ تھا جو خودی پر اتر گیا
اِس اَسپ کی رسائی ہے اپنی لگام تک

پانی کی پیاس ہی نے بجھائی لہو کی پیاس
اب بات جارہی ہے کسی تشنہ کام تک

ہم اپنے دشمنوں میں نہتے کھڑے رہے
ترکش کا ذکر کیا کہ تہی تھی نیام تک

دیوار گر رہی ہے ہمارے مکان کی
پہنچاؤ بات خضر علیہ السلام تک

O

رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم
کہ اپنی ذات کا معلوم بھی ہے لامعلوم

یہ زندگی جو مسلسل عدم کی گود میں ہے
وجود ہے کہ وجودِ عدم خدا معلوم

یہ آگہی ہے کہ نا آگہی کا خمیازہ
فشارِ فکر سے مجہول بن گیا معلوم

نہ کُھل سکے گا وہ حجرہ کہ جس میں ذات ہے بند
یہ اک طلسمِ انا ہے کسی کو کیا معلوم

یہ عذرِ ترکِ محبت بغیر حرف و بیاں
ہے قبلِ جنبشِ لب اُس کا مدّعا معلوم

وہ اجنبی سے در و بام کتنے دلکش تھے
جو اُس کے شہر میں ہوتے تھے آشنا معلوم

ہمیں خود اپنے سخن کا حساب رکھنا تھا
کہ ایک چُپ سے ہوا اس کا فیصلہ معلوم

O

بام و در پر ہجوم کرتی شام
ایک آسیب ہے گزرتی شام

لمحہ لمحہ اُترگئی مجھ میں
ساحلِ بحر پر اُترتی شام

میرے پہلو میں آکے بیٹھ گئی
اپنی تنہائیوں سے ڈرتی شام

دونوں کل میری راکھ پر تھے کھڑے
ڈوبتا آفتاب، اُبھرتی شام

سو گئے طائرانِ خوش پرواز
بن میں اب کس سے بات کرتی شام

میرے ماضی سے دشمنی کیوں ہے
میرے ماضی کو یاد کرتی شام

طاقِ جاں پر چراغ دھرنے کو
خلوتِ جاں میں پاؤں دھرتی شام

آج کس درجہ میں اداس رہا
آج تو مجھ سے بات کرتی شام

اور کچھ دیر اُداس رہ جاتا
اور کچھ دیر تک ٹھہرتی شام

○

کس نے کہا تھا میرے دوست، گھر میں اُسے بلاؤ تم
اب تو گزر گئی وہ شام، اب کہیں بیٹھ جاؤ تم

بوجھ ہے رہگزار پر چشم و نگہ کی روشنی
اب تو دُھواں ہوئی یہ رات اب یہ دیئے بجھاؤ تم

مہلتِ یک نَفَس تو دو مل لوُں میں اپنے آپ سے
مجھ سے مجھی کو چھین کر جب کہیں دوُر جاؤ تم

تم مری فکر مت کرو میں تو وطن بدوش ہوں
میری سنو تو دن ڈھلے گاؤں کو لوٹ جاؤ تم

تم پہ نثار کر چکا لمحۂ قربِ رائیگاں
میں تو سنا چکا بہت اپنی بھی کچھ سناؤ تم

آؤ اگر تو راہ میں فرش کروں میں چشم و ہوش
فرش کروں میں جان و دل، اور اگر نہ آؤ تم

دھوپ کڑی ہے دشت کی اور ہے دوُر کا سفر
سایہ ملے تو دو گھڑی کرلو کہیں پڑاؤ تم

اُس سے بچھڑ کے آج تک ناپ رہے ہو کوہ و دشت
وہ بھی بہت اُداس ہے اب کوئی گھر بناؤ تم

میرے عزیز ماہی گیر رزق کا وزن کم کرو
بوجھ بہت زیادہ ہے کھے نہ سکو گے ناؤ تم

O

کتنے بے بضاعت ہیں شہرِ جاں کے باہر ہم
دستِ نارسا دنیا کاسۂ گداگر ہم

آئینہ کا خالق تو آئینہ کے باہر تھا
ڈھونڈھتے رہے اس کو آئینہ کے اندر ہم

روشنی کی آنکھوں سے خون بن کے بہتے ہیں
شام ہی سے جلتے ہیں اپنے گھر کی چھت پر ہم

بے حدی کی دنیا میں کون کس کی حد ناپے
درد جب دوا ٹھہرا زخم ہوگیا مرہم

اب تو بے وفا دن بھی ڈوبنے ہی والا ہے
دوست بھی ہوئے رخصت طالب اب چلیں گھر، ہم

O

یہ سربکف پہاڑیاں یہ بے جگر پہاڑیاں
پھری ہیں کارواں کے ساتھ در بدر پہاڑیاں

اب اس فسونِ چشم و دل سے چھوٹنے کا ذکر کیا
کہ جانتی ہیں دِلبری کا ہر ہُنر پہاڑیاں

پہاڑیوں کی اُوٹ میں وہ گاؤں جاگتا رہا
تمام رات ہوسکیں نہ ہم سے سَر پہاڑیاں

چکور چاندنی میں ساری عمر چیختے رہے
کبھی تو حال پوچھتیں یہ چارہ گر پہاڑیاں

میں جنگلوں کا رِزق تھا وہیں کا ہو کے رہ گیا
اب انتظار چھوڑ دیں یہ خود نِگر پہاڑیاں

میں سُو تو جاؤں دشت کی اُداس شام اُوڑھ کر
اکیلی جاگتی رہیں گی رات بھر پہاڑیاں

○

میں فضاؤں میں گھومتا رہا دن گزر گیا اک اڑان میں
کوہ و دشت میں شام ہوگئی شب بسر کروں کس چٹان میں

ٹوٹی ناؤ پر یہ مرا سفر اعتماد ہے اپنے عزم پر
باد نامراد گن سکے تو گن کتنے چھید ہیں بادبان میں

میرے گاؤں کی یہ محل سرا اس کو کھا گئی شہر کی ہوا
کل تک اسمیں تھے گلبدن سے لوگ اب چڑیل ہے اس مکان میں

دوپہر کے وقت گلّہ چھوڑ کر ایک شاخ پر چڑھ کے سو گیا
کچھ پتہ نہیں کیسے آ گئی جانور کی خو گلّہ بان میں

چھت پہ چاند کو سوتے دیکھ کر فرطِ شرم سے دونوں بجھ گئے
اک چراغ تھا سطحِ آب پر اک چراغ تھا آسمان میں

مدتوں کے بعد وہ ملا مگر بے دلی سی تھی خوش دلی کے ساتھ
کرتے کرتے بات چُپ سا ہوگیا کوئی بات تھی اُسکے دھیان میں

وہ سواریاں جنگلوں کے بیچ تانگہ روک کر کیوں اتر گئیں
آدھی رات کو کیسے پوچھتا حوصلہ نہ تھا کوچوان میں

چھاؤں میں کٹا لوٗ کا گرم دن اپنے آپ میں اب پناہ ڈھونڈھ
اتنا جھک گیا جرمِ آفتاب دھوٗپ آ گئی سائبان میں

O

آنا ہی جب ٹھہرا پیارے پھر میل و فرسنگ کہاں
تم خود بھی اس بات کو سوچو کہاں کراچی جھنگ کہاں

کل کوئل کی کوک پہ کیسا خون رگوں میں اُچھلا تھا
جسم و جاں کے اس مقتل میں اب وہ حالتِ جنگ کہاں

ہاتھ کٹے تو دانتوں سے مشکیزہ ہم نے روکا تھا
ہم سے پہلے دہر میں ایسا عزم و وفا کا ڈھنگ کہاں

آج افشائے راز سے ہم پر کتنے پتھر برسے ہیں
دیکھیں ہم کو لے جاتی ہے کل یہ بارشِ سنگ کہاں

وہ تو کہیے اک حرفِ تشبیہ نے رکھّی اِن کی لاج
ورنہ باغ کے اِن پھولوں میں اُس کے جیسا رنگ کہاں

شامِ رخصت ریل کی سیٹی روح میں چُبھ کر ٹوٹ گئی
چھوڑو اُس کو پڑا رہنے دو نکلے گا یہ خدنگ کہاں

خواہشِ زر کی تیز ہوا نے ڈور سے رشتہ توڑ دیا
دیکھ رہے ہیں اہلِ محلّہ اب گرتی ہے پتنگ کہاں

○

جدا تو ہوگئیں آنکھوں سے روٹھ کر آنکھیں
مگر یہ طے ہے کہ روئیں گی عمر بھر آنکھیں

مرے عزیز اگر شوقِ خودنمائی ہے
تو گھوم قریہ بہ قریہ تلاش کر آنکھیں

سوادِ شب نے بہت حوصلہ بڑھایا تھا
سو پار اُتر گئیں آنکھوں میں ڈوب کر آنکھیں

بہت گھمنڈ ہے اس کائنات بینی پر
خود اپنے آپ کو دیکھیں یہ بے ہنر آنکھیں

یہ کس طلسم کی زد پر پڑا ہوں ناکارہ
مرے لہو میں رواں ہیں تمام تر آنکھیں

یہ کائنات ہے کن سورجوں کا مجموعہ
کھڑی ہیں دھوپ کی زد پر برہنہ سر آنکھیں

ہر ایک دید میں آنکھیں وسیلۂ دل ہیں
دلوں میں چور ہے بدنام ہیں مگر آنکھیں

O

میں آب و گِل کی اضافت کا اک تماشا ہوں
کہ تشنہ لب ہوں مگر اُس کے حق میں دریا ہوں

میں اپنے لمس کی بینائیوں سے عاجز تھا
سو اپنے دستِ خطا پر نقاب رکھتا ہوں

خبر کرو مرے کنعان کی ہواؤں کو
کہ مصرِ جاں میں غبارِ رہِ زلیخا ہوں

میں ایک ذرّۂ ناچیز و ناشناس سہی
مگر یہ ناز کہ حسبِ نظامِ صحرا ہوں

اگر یہ سچ ہے کہ ہر ذات اک سمندر ہے
تو پھر میں اپنے سمندر میں ڈوبنا چاہوں

مجھے نہ آنکھ دکھائے فرشتگی کا غرور
میں ریگ زارِ ازل میں نموٗ کا ایما ہوں

O

جسے گنوا کے آ گیا صنوبروں کی چھاؤں میں
اسے تلاش کر رہا ہے دل، گھروں کی چھاؤں میں

قبیلہ اپنی آن پر اَڑا رہا مگر حریف
اٹھا کے لے گئے کسی کو خنجروں کی چھاؤں میں

کلی کا ریشمی بدن جُھلس نہ جائے دھوپ سے
چھپا لے اے شبِ وصال، اُسے پروں کی چھاؤں میں

معالجوں کی خود فریبیوں کو علم ہی نہیں
کہ زخم اور بڑھ رہے ہیں نشتروں کی چھاؤں میں

یہ سوچ لو کہ کھا نہ جائیں منزلوں کو راستے
معاہدے تو ہو رہے ہیں رہبروں کی چھاؤں میں

○

بجھ جائیں گے وہ دیپ جو جلتے تھے گھروں میں
تقدیر نے لکھا تھا یہی شاستروں میں

وارث سرِ میدان کھڑے سوچ رہے ہیں
پہچان کا ہر نقش تو پنہاں تھا سروں میں

بیٹھی ہے چھپائے ہوئے اک ماں سرِ کہسار
سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے بچے کو پروں میں

پڑتی ہی نہیں دوسرے چہروں پہ نگاہیں
سو بات کی اک بات ہے یہ خود نِگروں میں

رات آئی، ٹہلنے لگیں گلیوں میں چڑیلیں
بیٹھے رہو در بند کئے اپنے گھروں میں

O

بَرستے بادلو ! پانی کی طُغیانی مجھے دیدو
سمندر لاکھ چِلائے کہ یہ پانی مجھے دیدو

مری دانائیو ! تم نے مری مجبوریاں دیکھیں
تو اب جاتے ہوئے، بچپن کی نادانی مجھے دیدو

مُجھے رونا ہے اپنے دل کے آثارِ قدیمہ پر
مرے لہجہ سے رونق لے کے ویرانی مجھے دیدو

خدا حافظ، اب اچّھے دِن گزارو اپنے کنبہ میں
اور اپنی زندگی کی ہر پریشانی مجھے دیدو

مرے بچّو ! مجھے آواز دی ہے روحِ صحرا نے
سو اَب گھر سے چلے جانے کی آسانی مجھے دیدو

بدلتے منظرو ! تبدیلیاں جبرِ سیاحت ہیں
جو دِل چاہے تو پس منظر کی یکسانی مجھے دیدو

سُنا ہے رابطہ کے ٹوٹنے پر بھی ہو خوش طالب
اگر سچ ہے تو دوعالَم کی حیرانی مجھے دیدو

○

شب نوردوں کے لئے اک آسرا رکھا کرو
تم کسی کھڑکی میں چہرے کا دیا رکھا کرو

کون جانے کس گھڑی آجائے کوئی شب نواز
رات میں بھی اپنا دروازہ کُھلا رکھا کرو

تم سے مل کر چونک اٹھتی ہیں مری محرومیاں
اوڑھنی کی اوٹ میں دستِ حنا رکھا کرو

جا رہا ہوں میں، مگر وقتِ ضرورت کے لئے
پاس اپنے جانے والوں کا پتا رکھا کرو

خود کو پرکھو (چھوڑ دو غالب کو اس کے حال پر)
زندگی کیسی بھی گزرے تم خدا رکھا کرو

مجھ میں ہمّت ہے تو میں جیتوں گا دریاؤں کے پاٹ
کون کہتا ہے کہ تم کچّا گھڑا رکھا کرو

یا تو نقدِ دلبری پہ ناز کرنا چھوڑ دو
یا خیالِ کاسۂ دستِ گدا رکھا کرو

O

اگر چاہو کہ مقتل پار کرلو
لہو کی دھار کو تلوار کرلو

میں ناقے پر کجاوہ رکھ رہا ہوں
اٹھو، اسباب اپنا بار کرلو

یہ کس نے کہہ دیا تم سے کہ خود کو
پرائی سوچ سے بیمار کرلو

وہ محمل رک گیا ہے راستے میں
بڑھو اور آخری دیدار کرلو

کسی لمحہ تو دل کا بوجھ کم ہو
سنو، مجھ سے کوئی اقرار کرلو

یہی سانسوں میں در آنے کی رُت ہے
تو پھر سانسوں کو ناہموار کرلو

یہ باتیں نثر میں لکھی نہ جائیں
سو اِن باتوں کو تم اشعار کرلو

○

مرا ہم سفر مرا ہم زباں ترا چہرہ
مری ناؤ پر سرِ بادباں ترا چہرہ

ہیں سمندروں سے نبرد میں مرے بازو
انھیں دے رہا ہے تسلّیاں ترا چہرہ

مرے نُطق و لب یہ دعا کریں ترے حق میں
سرِ شاخِ جاں رہے بے خزاں ترا چہرہ

سو بیک نظر اُسے دیکھنا نہیں ممکن
کبھی بے نشاں کبھی بیکراں ترا چہرہ

کبھی دھوپ ہے کبھی چاندنی ترا گیسو
کبھی دشت ہے کبھی سائباں ترا چہرہ

ساحل ساحل

تمہید

مین ہٹن میں پچھلے سال
بکھیرے بال
ہوا کی تال پہ ناچ رہی تھی
گلشن گلشن شامِ خزاں

زرد درختوں کی شاخوں پر
پرے جمائے، سر نیہوڑائے
اُلجھے پنچھی چپ بیٹھے تھے

میرے اور موسم (دونوں) کے کانوں میں
گونج رہی تھی پت جھڑ کی آواز
جسے دنیا والے کب سُنتے ہیں

ساحل ساحل حدِّ نظر تک
سارس بگلے، مؤرکھ پگلے
منظر کے افسوں میں گم تھے

متن

گھنے درختوں کا سایہ گہرا پانی
ریت کے ٹیلوں کے پیچھے ٹھہرا پانی
دامنِ کوہ میں گُم اندھا بہرا پانی
دیتا ہے ہر خشکی پر پہرا پانی
ساحل ساحل کتنی تازہ کاری ہے
تیکھے دلکش موڑ کماں آثار کٹاؤ
نہروں کی پایابی دریا کا گہراؤ
گہرے ناہموار سمندر کا پھیلاؤ
پس منظر میں پیہم اٹھتی گرتی ناؤ
آئینے پر رنگ کی مینا کاری ہے

شور سمندر کا ہو یا ندیوں کا فسوں
نیل و فرات و دجلہ و دنیوب و جیحوں
ہر ساحل کا ایک جداگانہ افسوں
ہر ساحل کی اپنی اک دلداری ہے
کہنہ شہر کی دلکش آبی راہوں میں
دور و دراز کی ویراں بندرگاہوں میں
سحر و طلسم کی رَو ہر گھاٹ پہ جاری ہے
روشنیاں لمحہ لمحہ اندھیر ہوئیں
رات کی تاریکی سے کرنیں زیر ہوئیں
موجیں تڑپیں گھاٹ پہ آ کر ڈھیر ہوئیں
جل پریوں پر نیند کا عالم طاری ہے

حاشیہ

اَنَاپُولس کی، خوابوں کی دنیاؤں جیسی
سُحر زدہ اک بستی میں

خواب آثار، حسین، طلسمی، شوخ گھروں
کے قدموں پر
ساحل اپنا سر رکھے خوابیدہ تھا
تُند ہوا کے غُرّاتے سناٹوں سے
اُٹھتی گرتی موجوں کے ہلکوروں سے
بپھرے، کف آلود تھپیڑوں کے ڈر سے
گھنے درختوں کی آغوش میں
ساحل چھپ کر بیٹھا تھا

میری زمیں کے بنجر اور ریتیلے ساحل
جن کی گود میں
اک تنہائی اک دلکش تنہائی کروٹ لیتی ہے
جن کی حُرمتِ بے ہُنری پر
اک گہرا سناٹا پہرہ دیتا ہے

ایک اداسی اک بے نام ونشان اُداسی
(حرف وبیاں کی گرفت سے بے پروا)
منڈلاتی رہتی ہے
دھوپ کی تابش ان پر سایہ کرتی ہے
چاندنی راتیں ان پر کُھل کے برستی ہیں

میرے پیارے کیٹی بندر اور بن قاسم
میرے پیارے سون میانی اور گڈانی اور گوادر
اپنی ناسرسبزی یا محرومی کا رونا رو کر
اَنا پولس کی شادابی سے
بھیک نہ مانگیں
ہر ساحل کی اپنی اک دلداری ہے

لاحیات

یہ شام
قاسیون کی پہاڑیوں سے
شہر پر اُترتی ایک سَر بُریدہ شام ہے

دمشق کے دُھواں دُھواں نشیب میں
ستاروں جیسے جلتے بجھتے بلب ٹمٹما اُٹھے
کہ مہرِ خستہ پیکر و شکستہ رُو
دمشق کے قدیم کاخ و کو پہ اک نگاہ ڈالتا ہوا گزر گیا

یہ شام میرے جسم و جاں میں لحہ لحہ ڈوبتی
اُداسیوں کا زہر انڈیلتی ہوئی
مرے وجود کی ہر اک رَمَق کے پار اُتر گئی

یہ کون ٹھیٹھ لہجۂ حلَب میں گفتگو کُناں

مری اُداسیوں پہ معترض ہوا
کہ ''یا اَخی!
جو صبحدم کی ساعتوں میں جامعہ کے لان پر
نگاہ آزما تھیں اُن دُھلی دُھلائی صورتوں میں کھو گئے؟
وہ ضرب کیا تھی جس سے ڈھیر ہو گئے؟
اگر نہیں
تو اِن پہاڑیوں پہ چڑھ کے اتنے تھک گئے ہو تم
کہ شام ہی کو سو گئے؟''

ابوشکیب! میرے پیارے دوست تم کو حق ہے اس مزاح کا
کہ تم تو میرے بچپنے کے دوست ہو
تمہارے ترکشِ دہن میں جتنے تیر طنز اور مزاح کے بچے ہوں
تم انھیں بھی مجھ پہ سر کرو
مگر میں رُوحِ بے قرار و مضطرب کا کیا کروں

یہ میری روح بے قرار و مضطرب
اگر بحیرۂ عرب کی ساحلی ہواؤں میں
اگر کسی پہاڑ پر صنوبروں کی چھاؤں میں
اگر گھنے بنوں کی اوٹ سر نہادہ گاؤں میں
بہ تاب وتب دکھائی دے تو اعتبار مت کرو

یہ میری روح بے قرار و مضطرب
کبھی گیا کے مندروں کی گھنٹیوں پہ جھومتی
کبھی دیارِ مسقط و عدن کی دھول چومتی
کبھی بروکلین اور ٹائم اسکوائر کے پیادہ رَو پہ گھومتی
غزل بہ لب دکھائی دے تو اعتبار مت کرو

اگر تمہیں وہ (ظاہراً)
ہجوم رنگ و نور میں گھری ہوئی
زَمالِک اور شارعِ الرَّشید کی فضاؤں میں
حریفِ شب دکھائی دے تو اعتبار مت کرو

کہ وہ تو اِن کی آڑ میں
سوادِ بَعلَبک سے لے کے
مَکلی وَ بھنبھور و تدمر و حلَب کے کُہنہ بام و در کے بیچ
اداس پھرتی رہتی ہے

سو اِس گھڑی بھی وہ کسی
لُٹے ہوئے اُداس کارواں کی گردِ راہ پر
نظر جائے اپنے آپ میں ہے گم

(وہ کارواں کہ جس کے وارثوں کے سر
سناں کی نوکِ ظلم پر
سوادِ شہرِ شام میں
دیئے کی لَو کی طرح ضوفشاں رہے
وہ قیدیوں کا کارواں
وہ بستۂ رسن شکستۂ سیاہ کارواں

حضورِ شاہ میں کھڑا
ملوکیت پہ زندگی کا سب سے گہرا طنز تھا)

مؤرّخین کے حضور میں کھڑی
یہ میری روح بے قرار و مضطرب
سوال کر رہی ہے اُن کی حرمتِ نگاہ سے
وہ بادشاہ کیا ہوا؟
وہ ہمہمہ کہاں گیا؟
وہ دبدبہ کہاں گیا؟
وہ طبل و نوبت و علم کہاں گئے؟
محل کے سات پھاٹکوں کے سنتری کہاں گئے؟
کدھر گیا وہ طمطراقِ سلطنت؟

تو پھر مؤرّخین کا جواب ہی دُرست ہے
کہ اُن ابَد پناہ قیدیوں نے جنگ جیت لی
(وہ جنگ جو حیات سے لڑی تھی لاحیات نے)

میں مشرق ہوں

ہملٹن کا یہ قصبہ حشر خیز وحشر ساماں ہے
سجیلی کھیتیاں، بانکے شجر، ہنستے ہوئے پودے
نشاط انگیز ونشّہ خیز وکیف آور
یہ قصبہ ایک جنّت ہے
کہ اس قصبہ میں تم ہو
اور تمہاری سانس کی خوشبو سے یہ خِطّہ معطّر ہے

مگر یہ کیا کہا تم نے
کہ ہم تہذیب اور تاریخ کی اُس آخری منزل پہ آ پہونچے
کہ آگے اب کوئی رستہ نہیں
یعنی مُکمل ہوگئی تاریخ
اور تہذیب اپنے منطقی انجام کو پہونچی

تو کیا یہ ظلم، دہشت پروری، غارت گری انجام ہے
تہذیبِ انساں کا؟
تو کیا تاریخ جابر حکمرانوں کی حویلی کے اندھیروں کی پلی
کوئی کنیزِ تیرہ فطرت ہے؟

تو پھر کیا ذہنِ انسانی کے خلیوں کی توانائی بھی
اپنے منطقی انجام کو پہنچی؟
تو پھر کیا یہ زمانہ رک گیا؟
لمحات ساکت ہو گئے؟
اور کیا مچلتے، دوڑتے، جُنباں، دواں، پرّاں

دَقیقے، ثانیئے سب مُنجمِد ہو کر معطّل ہو گئے

بولو

میں حیرت میں ہوں
تم نے وقت کو تاریخ اور تہذیب سے کیسے جُدا جانا؟
تمہارے پاس دولت ہے
تمہارے پاس طاقت ہے
زمینوں کی رگوں سے جبرِ ایجادات کی کھینچی ہوئی طاقت
اسی تہذیب کو تم آخری تہذیب کہتی ہو

تمہیں حق ہے
سو مغرب کے ادھورے، کم بضاعت فلسفوں پر ناز کرتی ہو
تم اپنے مُلک کے دانشوروں کے نام لے لے کر
مجھے مجبور کرتی ہو کہ میں مرعوب ہو جاؤں

مری نظروں میں چاروں وَید، اٹھارہ پُرانوں کے مباحث ہیں
میں آئی چِنگ سے ژندواَوِستا تک
اَوِستا سے بنو اِسحاق کے سارے صحیفوں تک
نہ جانے کتنے (لاتعداد) پھیرے کر چکا ہوں
کیا میں بتلاؤں
کہ مجھ پر مُورمن کی بائبل بھی آشکارا ہے
نہ جانے کتنی (لاتعداد) راتوں میں
مری آنکھوں کا روغن آنسوؤں کے روپ میں
گُمنام ماضی کے شکستہ اور قدیم اوراق پر ٹپکا کیا ہے
میں طبیعت اور مابعدِ طبیعت
اور وجود اور لاوجود اور اصل و ماہیت
پہ یونانی حکیموں کے بیاں
پڑھتا رہا ہوں
میں منطق پر ادب پر فلسفہ پر دین پر ہر عہد کے دانشوروں
کے زمزمے سنتا رہا ہوں

ہاں! مگر میں عہدِ حاضر کی جہالت خیز حکمت اور دانائی سے
ناواقف نہیں ہوں

ہاں! میں مشرق ہوں
گُرسنہ، ناتواں، غُربت زدہ مشرق
اَدُھوری ہے مری تاریخ
اور اب تک مری تہذیب ناقص ہے
کہ میرا وقت میرے ساتھ اک موعود منزل کا مسافر ہے

سو یہ بھی جانتا ہوں
دو مُقابل کے سِرے اک دوسرے سے
مل نہیں سکتے
تو پھر ایسا کریں
اک دوسرے کو بھول ہی جائیں

کسی دن

جب سروں پر برف ہوگی
کپکپاتے ہاتھ یخ بستہ لبوں پر رکھ کے
ہم بے نور آنکھوں سے
نئی تاریخ اور تہذیب کی کروٹ کو دیکھیں گے
امیرِ وقت جب رخشِ رواں کی باگ کھینچے گا

تو اچھا پھر ملیں گے
ہاں! ملیں شاید
کسی مَوعوُدِ مُستقبِل کی چوکھٹ پر

○

خموشیوں کو کلام جانے، سمندروں کو سراب دیکھے
اگر وہ تعبیر چاہتا ہے تو میری آنکھوں سے خواب دیکھے

درندے سیراب ہو چکے ہوں تو پھر لہو جنسِ رائیگاں ہے
رگوں کی دوزخ میں قید رہ کر وہ کیوں بقا کے عذاب دیکھے

وہ جس نے دیکھی نہ ہو خزاں میں بہار اجڑے ہوئے چمن کی
سناں سناں شاخِ آہنیں پر کٹے سروں کے گلاب دیکھے

کتاب جاں کے کسی ورق پر نہ مل سکی سطر عافیت کی
زمیں کی ہر فصل کو کھنگالا فلک کے سارے ہی باب دیکھے

کبھی تو یہ نفع پیشہ انساں مفادِ ذاتی کی قید توڑے
وہ اپنے خنجر کا دکھ بھی سمجھے جو اپنے خنجر کی آب دیکھے

کھنڈر کے زخمی کبوتروں کو یہ صورتِ حال ہی نئی تھی
وہ اپنے ہی زخم چاٹتے تھے کہ زخم خوردہ عقاب دیکھے

زمیں کے خودرَو فضول پودوں سے لڑتے لڑتے وہ تھک چکا ہے
کسان میں اب سکت کہاں ہے کہ بالیوں کا شباب دیکھے

بجا کہ خیّام کی رباعی ہے طنز منصوبۂ ازل پر
جو سرورق میں الجھ گیا ہو وہ کیوں درونِ کتاب دیکھے

O

بجلی چمکی بادل گرجے بادِ برق انداز چلی
جھوم کے اٹھی برکھا دیوی کھول کے زلفِ دراز چلی

سارے تارے ٹوٹ کے میری پلکوں پر آ بیٹھے تھے
میرا پورا ماضی لے کر رات کو جب پرواز چلی

ہم نے دیکھا اِک جنگل میں دو پتّے ٹکرائے تھے
پھر پیڑوں میں آگ لگی اور پورے بن کو نواز چلی

سڑک پہ پلنے والا بچّہ کن محلوں کا وارث ہے
بستی کی اک کہنہ روایت کھول کے کتنے راز چلی

جنگل سے جب چاند ابھرا میں نہر کے پُل سے اٹھ کے چلا
میرے ساتھ ہی اک گیدڑ کے رونے کی آواز چلی

رات کسی سفّاک پہر میں اڑ گیا قافلہ قازوں کا
صبح کو جھیل سے چیختی روتی ایک اکیلی قاز چلی

دل ٹوٹے یا پتے ٹوٹے ہم کو کچھ معلوم نہیں
ہم نے تو بس اتنا دیکھا بادِ خزاں آغاز چلی

O

شہر میں کربِ محرومی تھا دشت میں خود آزاری تھی
آج یہ راز کھلا ہے ہم پر، وہ تلوار دو دھاری تھی

پیڑ نے مجھ درویش کو اپنے بر میں چھپائے رکھا تھا
جس نے مجھ کو دو کر ڈالا وہ سلطان کی آری تھی

ہم تو کالی رات کی چھاؤں میں جانے کب تک سوئے رہے
پھر وہ ہماری بیداری کس چاند کی کارگزاری تھی

بستی بستی امن کا پرچم لہراتے کچھ لوگ چلے
لیکن ان کے اپنے گھروں میں جنگوں کی تیاری تھی

اپنے ڈیرے کو جب پلٹی ایک بھکارن شام ڈھلے
جسم کا بوجھ بہت ہلکا تھا بھیک کی گٹھری بھاری تھی

میں نے اپنے شعلۂ جاں سے جسم کو راکھ تو کر ڈالا
اب مجھے کچھ کچھ یاد آتا ہے وہ تجویز تمہاری تھی

ہم نے اپنی انگلی کل شب دیئے کی لَو پہ جلا ڈالی
دیا پرایا تھا طالب پر وہ انگلی تو ہماری تھی

O

چُپ رہے تو سنگ ہے کِھل اُٹھے تو پھول ہے
یعنی اُس کی ہر ادا اک نیا اصول ہے

تو نے اذن کیوں دیا وہ گیا تو پھر گیا
دو گھڑی کی مصلحت اک صدی کی بھول ہے

بارشوں کے قحط سے سطحِ آب گر گئی
اب کنووَں کی تھاہ میں جھانکنا فضول ہے

یک بیک پہاڑیاں اوٹ میں چلی گئیں
روشنی کی راہ میں دُھند ہے کہ دُھول ہے

بازیوں کو جیت کر میرے دل نے یہ کہا
جیت ہو کہ ہار ہو ہر طلب فضول ہے

اے عقابِ دلبری تو کہاں اتر پڑا
میرے دل کے دشت میں صرف اک ببول ہے

وہ ہے اقتدار میں اور سب عوام ہیں
اب تو جو بھی وہ کہے ان کو سب قبول ہے

O

نہ مُدّعی میں، نہ جرأتِ حق گواہ میں ہے
ضمیر شاید عدالتوں کی پناہ میں ہے

مرے سفر! مجھ کو کیا خبر تھی کہ اب وہ بستی
جہاں گئی ہے، وہ گاؤں اثنائے راہ میں ہے

میں پیاس اپنی منافقت کی بجھاؤں کیوں کر
کنویں کا پانی جو ڈول میں ہے وہ تھاہ میں ہے

کہ ترکِ خواہش بھی ایک خواہش ہے، اُس سے کہہ دو
نگاہِ درویش آج بھی اشتباہ میں ہے

یہ بہتے پانی پہ عکس ٹھہرا ہوا قمر کا
تضاد کی اک نئی حقیقت نگاہ میں ہے

کراہتا ہے فصیلِ سرما پہ اک پرندہ
گئے زمانوں کا سوز اس کی کراہ میں ہے

شناخت بنتی ہے شے کی مقدار ورنہ طالب
ہر ایک عُنصر جو کوہ میں ہے وہ کاہ میں ہے

O

یہ مانا اُس کی، موجوں سے شناسائی بہت ہے
مگر دریا کی ناہموار گہرائی بہت ہے

بظاہر کس قدر آساں تھا اُس کو بھول جانا
بُھلانے پر بھی اُس لہجے کی یاد آئی بہت ہے

سنا ہے آج وہ بستی سے رخصت ہو رہی ہے
اگر سچ ہے تو کیا ماتم کو شہنائی بہت ہے

یہ دل، محفل کے ہنگاموں سے اکتایا ہوا دل
پریشاں ہے، کہ اب محفل میں تنہائی بہت ہے

تم اُس کی تہہ میں امیدوں کے موتی ڈھونڈ تے ہو
یہ کینہ جو سمندر بھی تو ہرجائی بہت ہے

یہ سچ ہے اُس کا چہرہ عام چہروں کی طرح ہے
مگر اُس قامتِ زیبا میں رعنائی بہت ہے

اگر اظہارِ نسبت میں ہے بدنامی کا خطرہ
تو پھر اقرارِ نسبت میں بھی رُسوائی بہت ہے

O

نیک ہی کا دوسرا پرتو ہے جو کچھ بد میں ہے
عقل کی ہر بات میزانِ قبول و رد میں ہے

آج بھی انکارِ سجدہ کی صدائے بازگشت
جہل و اِستکبار کے ٹوٹے ہوئے گنبد میں ہے

بے صدا گلیوں میں کُتّے رات بھر روتے رہے
پھر یہ بستی ایک نادیدہ بَلا کی زد میں ہے

مرمٹا پیارے سمندر تو بھی پورے چاند پر
وہ تو خود تیری طرح گردابِ جَذر و مَد میں ہے

دشت میں بھی مطمئن ہو دل تو مل جائے اُسے
وہ گھنیری چھاؤں جو بستی کے اِس برگد میں ہے

کوئی ریلا مال و اسباب و مویشی لے گیا
مطمئن تھے سب کہ یہ سیلاب اپنی حد میں ہے

اب مفادِ ذات سے باہر نکلنا ہے فضول
ہم نے اپنالی ہے وہ خصلت جو دِیو و دَد میں ہے

O

جذبۂ منزل شناسی کا صلہ دیتی رہی
یہ زمیں، نو واردوں کو راستہ دیتی رہی

دل معیشت کی چتا میں عمر بھر جلتا رہا
گھر کی دیوی اُس کے شعلوں کو ہَوا دیتی رہی

اُس کے سیمیں ہاتھ اُپلے تھاپنے میں محو تھے
دلبری چشمِ حقارت کو سزا دیتی رہی

دل کے خاکستر سے رات اڑتی رہیں چنگاریاں
روشنی بجھ کر بھی منزل کا پتہ دیتی رہی

اپنی سیرت لکھ گیا سوئے ہوئے چہروں پہ چاند
رات اپنے ہم نشینوں کو صدا دیتی رہی

دم بہ دم بڑھتا رہا صندوق موجِ نیل پر
مامتا ساحل سے بچے کو دعا دیتی رہی

•

O

اُس بدن کی رُت ہوائے مہرباں لے آئی ہے
ہے کہاں کی بات، دیوانی کہاں لے آئی ہے

ریت کے ٹیلوں کی تنہائی ! مجھے سونے تو دے
پھر وہی خوشبو سرِ ریگِ رواں لے آئی ہے

اُف یہ وحشت ناک خاموشی کہ تارے بھی ہیں چُپ
دشت کی رات آج کیسا آسماں لے آئی ہے

دشت پیمائی ہُنر ٹھہری تو اے گردِ سفر
مجھ غبارِ بے ہُنر کو تو کہاں لے آئی ہے

کھولتے لاوے کو صدیوں میں بنایا تھا چٹان
زندگی پھر اک نیا آتش فشاں لے آئی ہے

اب اُسی سر سے ملے گی آدمی کو روشنی
تیرگی جس کو سرِ نوکِ سناں لے آئی ہے

ہم اگر آزاد فطرت تھے تو اے روحِ سفر
ہم کو جنّت سے اٹھا کر تو کہاں لے آئی ہے

O

کیا خبر میری شبِ ہائے غم مجھ سے چُھٹ کر کدھر جائیں گی
دے سکا گر نہ کوئی پناہ، لازماں میں اُتر جائیں گی

خوف و دہشت کی آندھی چلی بجھ گئے جسم و جاں کے دیئے
کیا خبر تھی کہ یہ مشعلیں گُھپ اندھیرے سے ڈر جائیں گی

یہ شبِ ماہ اور یہ کھنڈر آ طلسمات کی سیر کر
اُڑتی چمگادڑوں سے نہ ڈر یہ کنویں میں اُتر جائیں گی

کوہساروں میں شام آ گئی، تو بھی ڈیرے کو چل اے فقیر
اب یہ بے اُنس چرواہنیں لَوٹ کر اپنے گھر جائیں گی

جلتی شمعوں سے دھوکہ نہ کھا زندگی ان کی ہے تا سحر
یہ بنات شب تار ہیں دھوپ پڑتے ہی مر جائیں گی

شام غم تو سلامت رہے تیرے ہی دم سے ہیں رونقیں
ورنہ یادوں کی یہ ٹولیاں دن نکلتے بکھر جائیں گی

اُڑتی قازوں کی ڈاروں کا عکس اپنی آنکھوں میں محفوظ کر
گرمیوں میں یہ بنجارنیں جھیل سے کوچ کر جائیں گی

O

عمر بھر کس قدر مطمئن وہ رہا اپنے بستر پہ کروٹ بدلتے ہوئے
زندگی ہم نے آخر گنوا دی میاں، دیس کی شاہراہوں پہ چلتے ہوئے

لازماں اور زماں ایک ہی چیز ہیں یا کہ اضداد ہیں فیصلہ وہ کرے
جس نے دیکھا ہو ناخن کو بڑھتے ہوئے جس نے دیکھی ہو کونپل نکلتے ہوئے

ریل کی پٹریاں کھڑکھڑانے لگیں چند لمحوں میں اسٹیشن آ جائے گا
جاگ اے میری تقدیرِ خوابیدہ جاگ اٹھ گئے لوگ آنکھوں کو ملتے ہوئے

تیرہ تھی اس جبیں کی ستارہ وشی شاخِ مژگاں پہ تھے آنسوؤں کے کنول
شامِ رخصت کے اُس سرد موسم میں بھی ہم نے دیکھا ہے لوہا پگھلتے ہوئے

ہم سڑک سے گزرتے جنازوں پہ بھی سرسری سی نظر ڈال کر چل دیئے
ہم وہ گوتم کی ضد ہیں کہ رقصاں رہے آپ اپنی چتاؤں پہ جلتے ہوئے

اپنے انڈوں پہ بیٹھی ہوئی فاختہ کس قدر مضطرب اور بے چین تھی
گھونسلے کے قریب اس نے دیکھا تھا جب سانپ کو ایک ٹہنی پہ چلتے ہوئے

اُس اندھیرے میں شاید مرا جسم تھا لالٹین اور دیوار کے درمیاں
رات کی تیرگی دیکھتی رہ گئی ایک پیکر کو سائے میں ڈھلتے ہوئے

O

یہ آج خوف سا کیوں شیر کے شکار میں ہے
یقیناً اُس کے علاوہ بھی کچھ کچھار میں ہے

وہی تو ہے مرے کسبِ معاش کا تاوان
وہ سیم و زر جو ریاست کے اختیار میں ہے

ذرا سنبھل کے قدم رکھ کہ اک زمانے سے
یہ شہر اپنے مفادات کے فشار میں ہے

ہوا جلا کے مجھے گھر کی چھت پہ رکھ آئی
میں وہ دیا ہوں جو آندھی کے انتظار میں ہے

پڑوس چھوڑ گیا اور ہمیں خبر نہ ہوئی
وہ ناسپاس نہ معلوم کس دیار میں ہے

○

خلوتِ جاں میں چیخ رہا ہوں کوئی نئی عریانی دے
جیسے دشت میں پیاسا چیخے میرے مولا پانی دے

دل اپنا اُکتا سا گیا ہے منظر کی یکسانی سے
کوئی انوکھا رُوپ دکھا کر آنکھوں کو حیرانی دے

اس فصلِ بے آب میں جل گئی کھیتوں کی ہریالی بھی
شہرِ وصال کے کالے بادل سوکھے دھان کو پانی دے

یادوں کا ویران جزیرہ برسوں تک آباد رہے
ہجر کا موسم اچھا گزرے ایسی کوئی نشانی دے

رات سے پہلے گھر آجانا دُھند اُترنے والی ہے
رات کہاں سے خوشیاں دے گی شام ہی جب ویرانی دے

O

جس میں یوں ہوا چلی دل کا فراغ لے گئی
شہر سے امن لے گئی گھر سے چراغ لے گئی

اب اسے ڈھونڈھتے پھرو قریہ بہ قریہ کو بہ کو
تیرگیِ شبِ وِداع اُس کے سراغ لے گئی

کون اب آئے گا یہاں قحط زدہ ہیں بام و در
اپنے گھروں کی بے زری بانگِ کلاغ لے گئی

پھر سرِ شاخ مصلحت اُس کے لبوں کی فاختہ
امن کے جھوٹ دے گئی جنگ کے داغ لے گئی

O

غمِ عاشقی تری خیر ہو، مری کائنات سنوار دی
جسے رد کیا تھا دماغ نے، وہی بات دل میں اتار دی

میں صدف ہوں اپنی نہاد میں تو سمندر اپنے مزاج میں
وہ جو زندگی مرے پاس تھی ترے ساحلوں پہ گزار دی

میں چلا تھا گھر سے تو حرف و جذبہ وحس کے ٹھگ مرے ساتھ تھے
فقط ایک پونجی تھی عقل کی وہی جا کے میلے میں ہار دی

یہ بجا کہ مجھ سے دوکاندار نے نقدِ خیر تو لے لیا
وہ جو جنّت اس کی گرہ میں تھی مجھے دے تو دی پر ادھار دی

سرِ راہ میرا مطالبہ فقط ایک لقمۂ نان تھا
مگر اُس نے میرے مطالبے پہ سواریوں کی قطار دی

O

روشنی کا پیکر ہے چاندی کی مورت ہے
ناشکیب لمحوں میں وہ مری ضرورت ہے

حرف و صوت کی کڑیاں بار بار ٹوٹی تھیں
اس سے بات کرنے میں لفظ بے ضرورت ہے

کل ہمیں نظر آئے آئینہ نُما چہرے
یہ تمیز مشکل تھی کون کس کی صورت ہے

جس چراغ نے دل کو راستہ دکھایا تھا
وہ چراغ ہی شاید عقل کی ضرورت ہے

کل تو میرے لہجہ سے مطمئن ہوا وہ شخص
آج کیوں وہی لہجہ باعثِ کدورت ہے

O

یہ بستی اتنی پُر اَسرار کیوں ہے
یہاں چاروں طرف دیوار کیوں ہے

اگر انکار ہے اقرار کی ضِد
تو پھر انکار میں اقرار کیوں ہے

اگر راضی نہیں ہے قافلے سے
تو پھر یہ راستہ ہموار کیوں ہے

شجر کی شاخ میں اٹکا ہوا چاند
یہ میری رات میں بیدار کیوں ہے

ازل سے تا ابد ہے ایک لمحہ
تو پھر یہ وقت میں رفتار کیوں ہے

برسنا اُس کی فطرت ہے تو برسے
مگر یہ ابر، برق آثار کیوں ہے

وہ میرا انتخاب اب بھی نہیں ہے
تو اُس کا ترک دِل پر بار کیوں ہے

○

کون جیت سکتا ہے عزمِ چرخ پیما سے
سانپ ہار جاتے ہیں چوبِ خشکِ صحرا سے

تم تو خوب واقف ہو کب خراج لیتا ہے
سامری کا گوسالہ پیروانِ موسیٰ سے

لے کے ہاتھ میں پانی پھینکنا بتاتا ہے
تشنگی نچوڑی ہے اس نے موجِ دریا سے

موجِ مہرباں تجھ سے فاصلوں سے ملنا کیا
چشمِ تر ہوئی سیراب ہونٹ رہ گئے پیاسے

چاکِ پیرہن تسلیم، ہم پہ یہ کرم کیسا
ہم کہاں کے یوسف ہیں، پوچھنا زلیخا سے

ہم سے خوش نگاہی کی بھیک لینے آئے ہیں
دستِ گُل فروشاں پر یہ دھرے ہوئے کاسے

اس اندھیری دنیا کو نور بخشنے والو
تم کو بھیک ملتی ہے کس سخی کی دنیا سے

○

تو سفر کی ہولناکی سے نہ ڈر اے اجنبی
کٹ ہی جائے گی یہ راہِ پُرخطر اے اجنبی

تُجھ سے ہوجائے تعارف، آ مرے پہلو میں بیٹھ
اے مرے دل، اے مرے یارِ سفر، اے اجنبی

یہ جہاں محشر ہے اِس میں کون کس کا آشنا
اجنبی ہونے کا اتنا غم نہ کر اے اجنبی

جا، سرائے کے کسی گوشے میں جاکر لیٹ جا
سوگئے رات اوڑھ کر سب بام و در اے اجنبی

وہ مسافر اب کہاں پلٹے گا، اس کو بھول جا
کون آتا ہے سفر سے لوٹ کر اے اجنبی

میں بھی تیری طرح ویرانوں میں لیتا ہوں پناہ
کاٹنے لگتا ہے جب اپنا ہی گھر اے اجنبی

زندگی اک پل کی مہلت ہے، اسے ضائع نہ کر
سیکھ لے مقتل سے جینے کا ہنر اے اجنبی

منتظر ہے نہر کے اُس پار اک نادیدہ گاؤں
رُخ بدل اور کاٹھ کا پُل پار کر اے اجنبی

کیسۂ جاں میں، تجھے دینے کو اب کچھ بھی نہیں
سو دعائے خیر لیتا جا ٹھہر اے اجنبی

برگِ نوا ☆

یاد تو ہوں گے تجھے آبِ روانِ فرات
ماضیٔ نایافت کے گزرے ہوئے واقعات

نیند کی پگڈنڈیاں خواب کے برگ و ثمر
بن کے بگولوں کا ذکر باغ کے پھولوں کی بات

فَنِ خُطوط و نقوش بَطنِ عدم میں نہاں
قُلزمِ فطرت میں گُم صنعتِ کلک و دوات

سادہ مزاج آدمی جس کو خبر ہی نہیں
ڈھلتے ہیں کیسے تبر کیسے پگھلتی ہے دھات

اپنے مفادات تک اپنی نظر کی دَوِش
ایک ہی دُھن سربسر یعنی فقط حبِّ ذات

☆ بین الاقوامی تہذیب و حکمت کے نام

کون ہے جس میں نہیں حُبِّ بقائے دوام
کون ہے ایسا یہاں جس کو مِلا ہو ثبات

حالتِ فرسودگی اُن پہ بھی طاری ہوئی
بابِل و اُر کے محل کھا گئے لمحوں سے مات

ہے انہیں لمحوں کا کھیل سلسلۂ روز و شب
رات کے پیچھے ہے دن، دن کے عقب میں ہے رات

وقت مہ و سال کی وہ اَبدی باؤلی
جس کا عُمق بے نشاں جس کی فضا بے جہات

وقت اک اندھا کنواں ڈول ہے تہہ میں نہاں
ڈول کی رسّی پہ ہے مُور و مگَس کی برات

حجرۂ بے نام میں گردشِ ایام میں
اک گُزَراں دام میں قید ہیں کُل ممکنات

وہ بھی گزرتا تو ہے جو کہ گزرتا نہیں
اُس کے طلسمات میں ایک ہے موت و حیات

شوکتِ اقوام ہے اُس کے خزانوں کی بھیک
حشمتِ تہذیب ہے اُس کی گرہ کی زکات

کوئی بھی تہذیب ہو عرصۂ تہذیب میں
کوزہ گروں پر رہی کوزہ فروشوں کی گھات

حرفِ بدیہی پہ بھی حربۂ شک چل گیا
آتشِ تشکیک سے راکھ ہوئے کلیّات

عقل کے افلاس کو بھیک ملی وہم سے
دل کے مضافات میں بننے لگے سومنات

تیشۂ توحید سے ٹوٹ گئے یک بیک
دل کے یعوق و یغوث عقل کے لات و منات

پھر بھی تعاقب میں ہے بے جہتی عزم کی
اپنے جلَو میں لئے سلسلۂ حادثات

خواہشِ تسلیط سے لرزہ بر اندام دہر
فتنۂ تسخیر سے خوف زدہ کائنات

ایسی طلب ہے فضوُل جس کی کوئی حد نہ ہو
زیست عبث ہے اگر زیست میں مقصد نہ ہو

زندگی بے ہدف رہنِ مسائل تمام
کربِ معیشت کی صبح دردِ محبت کی شام

ہجر کے لمحے فضول وصل کی ساعت عبث
ذات کنارِ عدم زیست سرِ لادوام

زیست کا ہر مرحلہ اک سفرِ ناشناخت
ریگِ مہ و سال پر پائے سفر کا خرام

روزِ ازل جب ہوئی جہل کی یورش تو عقل
خود ہی ہٹالے گئی نہر سے اپنے خیام

کوزۂ خالی میں ہے آبِ بقا کی تلاش
حَرف و ہنر تشنہ کام، نطق و نموٗ تشنہ کام

دیدۂ ادراک میں چشمِ ہوس کے لئے
عصمتِ یوسف بھی دام دستِ زلیخا بھی دام

شجرۂ اضداد کا مورثِ اعلیٰ ہے ایک
ہے وہی سرِّ سکوت جو بھی ہے رمزِ کلام

طیش کے باطن میں ہے عیش کی جلوہ گری
اُلفت و نفرت ہیں کیا، ایک ہی جذبے کے نام

نعرۂ حکم و قضا مصلحتِ شہریار
نغمۂ عِلم و ہنر مَرحمتِ فکرِ خام

لاکھ نشیمن کہے برق کو اپنا عدو
نسبتِ باراں سے ہے برق کا اپنا نظام

آج بھی ہے حملہ وَر دانت نکالے ہوئے
پچھلے یُگوں کی چڑیل جس کا ثقافت ہے نام

وقت کے فرہنگ میں جبر ہے ہر اختیار
دستِ قضا چوبِ خشک پائے قدر سُست گام

وقت کی قیمت ہے کیا دَستِ گُل انداز میں
اک سَبدِ رائیگاں جس کا نہیں کوئی کام

اس کا شجر بے ثمر اس کا صدف بے گُہر
یاورِ بے منزلت داورِ بے احترام

بے ہدف و مضمحل بے طرف و منفعل
بدنظَروں پر حلال دِیدہ وَروں پر حرام

صرف اُسی پَل میں ہے اَرزشِ جنسِ وجود
جب ہو نَفَس مُشک بُو جب ہو حیا لالہ فام

لطفِ یقیں بے گماں حسنِ طلب بیکراں
تیرِ نگہ بے کماں تیغِ جَسَد بے نیام

اور یہ لمحہ بھی کیا، نقش گرِ حبِ ذات
ملتا ہے جس کے طفیل اپنے لہو کو دوام

نسل بنا جب لہو سوکھ گیا نخلِ جاں
ایک طرف ابتداء ایک جہت اختتام

صنف کی آواز پر جھوم رہا ہے بشر
دائرۂ جسم میں گھوم رہا ہے بشر

عُنصرِ خاکی سے ہے اس کے جسد کی نمُود
صیدِ سن و سال ہیں اس کے حدود و قیُود

سجدہ گہِ نور تھا آدمِ خاکی نژاد
سہمِ قضا بن گئی تنگیِ چشمِ حسوُد

اک خسِ بے مایہ تھا نہر میں بہتا رہا
آنکھ دکھاتی رہی گرچہ ہر اک موجِ رُود

ذہنِ توانا کا صید جوہرِ خورشید و ماہ
دیدۂ بینا میں قید وسعتِ چرخِ کبُود

عقل و نظر کا عیار ایک مقدس جنوں
نطقِ بشر کا وقار ایک الوہی سرُود

وہ ہے عدو نفس کا، نفس ہے اُس کا عدو
اُس کی حیات اِس کی موت، اِس کا زیاں اُس کا سوُد

اِس کے تساہُل میں ہے اُس کے جوارح کا بُخل
اِس کی تمنّا میں ہے اُس کے ارادوں کا جوُد

نفس کے تابع ہوں گر جذبہ و فہم و شعور
توڑ نہ ڈالیں کہیں اپنے شرف کے حدوُد

نفس کا پیرو رَہے گر جَسَدِ بے ہُنر
کیسا قیام و قعود، کس کا رکوع و سجُود

دیدۂ آفاق میں ماضی و حال ایک ہیں
نفس کی حرکت سے ہے تفرقۂ ہست و بوُد

جنس کی وحدت نہیں ہم صفتی کی دلیل
چوبِ صنوبر کبھی جل نہ سکی مثلِ عوُد

فکرِ اضافی سے ہے حجلۂ معنی میں رنگ
میرے لئے غیب ہے جو بھی ہے تیرا شہوُد

غیر کی نسبت سے ہے ہر کہ و مہ کی شناخت
دیکھ لیا لاعدم چھان لیا لاوجود

درکِ معانی پہ ہے لذّتِ جاں کا مدار
کشفِ حقائق میں ہے دیدہ و دل کی کشود

رُک نہ سکی چشمِ شوق نقشِ ہنر دیکھ کر
دستِ ہنرمند پر جھک گیا فرقِ ہنود

خیمۂ ہستی میں آگ چشمِ خرد میں دھواں
شمع کے تابوت پر نالہ کُناں موجِ دُوْد

خاک کے پُتلے میں یوں دفن ہے روحِ کمال
راکھ کے سینے میں ہو جیسے شرر کا خمود

عزمِ تکامُل کو پھر ملتی ہے تازہ حیات
ٹوٹنے لگتا ہے جب ذہنِ بشر کا جمود

منزلِ تسلیم میں نفس ہوا سجدہ ریز
تیرہ شبی سے ہوئی نورِ سحر کی نمُود

صبح نے مانگا خراجِ سلطنت شام سے
شہرِ تمدن سجا جلوۂ الہام سے

سوئے تمدّن چلا قافلۂ جسم و جاں
بن کے غبارِ سفر ساتھ چلیں بجلیاں

شہر بسے گھر بنے بام بنے در بنے
دور ہوئیں فرد سے ذات کی تنہائیاں

فرد کے کردار پر شہر کے آثار پر
برق مفاد و طلب ٹوٹ پڑی ناگہاں

جب بھی مفادات کی زد ہو مفادات پر
ذات میں کرتا ہے گھر فتنہ و شر کا دھواں

خاک کی تقسیم سے نسل کی تقسیم تک
اک طبقاتی نظام بے رگ و بے استخواں

کس کو نہیں یہ خبر اس کرۂ ارض پر
جتنے بھی انسان ہیں، ہے یہ زمیں سب کی ماں

کیسے یہ فرزند ہیں بانٹ رہے ہیں اُسے
جس کا لہو چوس کر آج ہوئے ہیں جواں

ان کی بقا کا مدار دوہرے اصولوں پہ ہے
حق کی طلب میں حریص فرض سے دامن کشاں

یہ صَنَمِیّات کی گود کے پالے ہوئے
بے بَصَر و بے ہُنر، بے نَسَب و بے نشاں

آج پھر اقوام کی ناؤ تلاطم میں ہے
تند ہوا حرص کی توڑ نہ دے بادباں

وحشتِ حاضر سے گُنگ چیخنے والا ضمیر
دہشتِ فردا سے لال بولنے والی زباں

مُہر بہ لب ہے قضا چشمِ بصیرت ہے کور
دستِ دعا ہے بلند اشکِ خطا ہے رواں

بطن سے اس خاک کے پھوٹے اک ایسا سماج
جس سے ملے خلق کو نعمتِ رزق و اماں

بانٹ سکے جس میں باز قلبِ کبوتر کا دُکھ
زِیست کی گلیوں میں ہو ہم نَفَسی حکمراں

جس میں سب آزاد ہوں جس میں نہ ہو جوع و خوف
سب کی زمیں ایک ہو سب کا ہو ایک آسماں

عزم کے ہودَج میں ہو لیلیٰ جاں کا سفر
قافلۂ دل کو ہو عقلِ بشر ساربان

ناطقہ و چشم و گوش ایک ہی جادہ پہ ہوں
نوعِ بشر کے لئے دل کا ہو لب ترجماں

اپنی جدا اک شناخت رکھتی ہوں قومیں مگر
وحدتِ اقوام کی سمت چلے کارواں

نقطۂ انجام ہو وحدتِ فکرِ بشر
نقطۂ آغاز ہے وحدتِ نظمِ جہاں

جب یَمِ اِحساس کو اذنِ روانی ملے
دیدۂ الفاظ کو تابِ معانی ملے

تُندیٔ احساس میں گر نہ ہو معنی کی تاب
حرف مُجسّم سراب لفظ سراپا حباب

آبِ روانِ فُرات یاد تو ہوگا تجھے
تیرے کنارے اُگا جب مرا نخلِ شباب

دیکھنے آئے مجھے کتنی نگاہوں کے تیر
چومنے آئے مجھے کتنے لبوں کے گلاب

مجھ پہ رہی مہرباں کتنے کھجوروں کی چھاؤں
مجھ پہ ہوئے منکشف کتنے ستاروں کے باب

پھر بھی خلش ہی رہی ذہنِ کم آموز کو
نبض کی حرکت فنا سانس کی ڈوری سراب

ایک دقیقے کی بھول پوری صدی کا زیاں
ایک بشر کی خطا نسلِ بشر پر عذاب

آبِ روانِ فرات نیل کے ساحل پہ بھی
دیکھ چکا ہے کوئی پچھلے زمانوں کے خواب

جب بھی کسی شام میں پہلوئے اہرام میں
خرچ ہوا نقدِ دل عقل نے مانگا حساب

ریت کے صحراؤں پر سرمہ برسنے لگا
مکتبِ جاں میں کھلی عہدِ کہن کی کتاب

بَعل کے مندر چلیں مصر کی شہزادیاں
رتھ کے دریچوں کی اوٹ ڈوب گئے ماہتاب

دشت و در و بام پر گرم لہو کی دھنک
سایۂ مہتاب میں خوش قدم و بے حجاب

کوئی نبی قوم کو اپنے وطن لے چلا
ظلم شکستہ ہوا صبر ہوا کامیاب

سطوتِ شاہی کے ساتھ ڈُوب گئے لشکری
مَوج ملی مَوج سے فَوج ہوئی غرقِ آب

پھر انہیں مَوجوں پہ تھی سطوتِ شاہی کی ناوَ
پھر وہی یوسف کی نسل پھر وہی قہر و عتاب

روزنِ تاریخ سے آج بھی ہے خندہ زَن
حکمتِ زَرتُشت پر گُنبدِ اَفراسیاب

دانش و حکمت فضول خُلق و مروّت فضول
ذہن کی جَودت فضول عقل کا خانہ خراب

وقت کی اَنٹی میں تھا ایک ہی سِکّہ کھرا
تیغ ہو جس ہاتھ میں بس ہے وہی کامیاب

زور کی تہذیب کیا زر کے تمدّن کی نیو
ماضی بے فیض سے حال ہوا فیض یاب

جبر کی زنبیل میں دو ہی تمدّن تھے کیا
دولتِ قاروں نہاد، طاقتِ کیَواں جناب

ذہن و خرد آج بھی قیدِ عناصر میں ہیں
دو ہی بڑے مسئلے فکرِ معاصر میں ہیں

آج بھی ہیں زور و زر شمعِ سرِ انجمن
وقت کے چہرے پہ ہے نامتناہی تھکن

ہیکلِ تہذیب کے صحنِ خردزار میں
بھوک بھی ہے خیمہ زن خوف بھی ہے خیمہ زن

طاقتِ عظمیٰ کے شیر تختِ سیاست کے شاہ
خلعتِ زرّیں کی طرح بانٹ رہے ہیں کفن

نان کی مشکل کا حل دینے اٹھا تھا جو ملک
نان کی نایافت پر ٹوٹ گیا دفعتہً

ارضِ فلسطین بول راز نہاں کچھ تو کھول
عدل کی میزاں میں تول جنسِ ضمیر وطن

فلسفۂ آدمی زیست پئے زندگی
فلسفۂ آگہی زیست پئے فکر و فن

فلسفۂ سلطنت زیست پئے عزّ و جاہ
فلسفۂ شیطنت زیست پئے اہرمن

زیست کو جانیں گے کیا وقت کے مُردہ فروش
زیست کو مانیں گے کیا آج کے یہ گورکن

جن کی نظر میں حرام حُرمتِ نام و نسب
جن کے لغت میں مُباح رابطۂ مرد و زن

کردوں اگر دہر پر معنیٔ زیست آشکار
کانپ اٹھیں شرم سے رُوم و فِرنگ و خُتن

زِیست اَنا کا سجاؤ زیست وفا کا رچاؤ
زیست نظر کا بچاؤ زیست حیا کی پھبن

زیست سلیماں کا گیت زیست فلاطوں کی نثر
زیست احد کی ثنا زیست صمد کا بھجن

زیست جمالِ شہود زیست جلالِ غیوب
زیست بلالِ حبش زیست اُویسِ قَرن

زیست دل مرتضیٰ زیست شبِ غارِ ثور
زیست نبی کی حیات زیست خدا کا سخن

زیست بنوں میں خیام زیست تنوں پر حسام
زیست سِنانوں پہ سر زیست گلوں میں رسَن

زیست کوئی انتظار تاحدِ آفاقِ جاں
زیست کوئی اضطراب تا خلشِ جان و تن

زیست کے ہر پَل سے ہے عِزّتِ نفس آشکار
زیست کے ہر گَل میں ہے حکمتِ ماضی کا دھن

اے بن آدم یہ سب تیری ہی میراث ہیں
خاک و فضا و ہوا وادی و دشت و دمن

گر تجھے لڑنی پڑے ورثۂ آ[illegible] کا[illegible] جنگ
کرلے شہادت قبول، د[illegible] [illegible]ن

نان و نمک پر نبرد عقل کی تنسیخ ہے
سب سے بڑا مسئلہ منطقِ تاریخ ہے

منطقِ تاریخ ہے ظلم کا حرفِ طویل
سلطنتوں کا حصول ان کی بقا کی سبیل

منطق تاریخ ہے تقویتِ اقتدار
جبر کے اطراف میں کلکِ ہوس کی فصیل

منطق تاریخ ہے رزمِ شہی کا جواز
منطق تاریخ ہے عزمِ شہی کی وکیل

ذہنِ مورّخ فقط شاہ کا فتویٰ نویس
دستِ مورّخ لئیم کلکِ مورّخ بخیل

اس کی نگاہوں میں ہیچ نہضتِ علم و عوام
اس کے خیالوں میں پوچ حرکتِ فکر و دلیل

اس کو بھلا کیا پتہ کون ہیں یہ خود شناس
ہند و عَجم کے حکیم چین و عَرب کے عقیل

اس کو بھلا کیا غرض کیا ہے نزولِ کتاب
کیوں ہے ثبات آشنا رفعتِ طور و گلیل

اس کو بھلا کیا خبر منبرِ فاران سے
تشنگی عقل کو کیسے ملی سلسبیل

کیسے سنواری گئی ہاتھ میں تیغِ جلال
کیسے اتارا گیا نطق میں حرفِ جمیل

صفحۂ تاریخ پر صرف وہ لمحے ہیں نقش
جن میں ہو فوجوں کی چیخ یا ہو فرَس کی صہیل

اس کے خزانوں میں ہے آج بھی جنسِ گراں
نیزۂ خَطّی کا وار ضربتِ تیغِ اصیل

فوج پہ کیسا گھمنڈ دیدۂ فرعون دیکھ
بے وطنوں کے لئے چاک ہوا آبِ نیل

کثرتِ افواج کو جب بھی ہو طاقت پہ ناز
قلّتِ افراد سے ہوتی ہے آخر ذلیل

آج بھی قرآن میں عبرتِ اقوام ہے
حفظِ حرم کے لئے رزم ابابیل و فیل

مغز کا خواہاں ہے گر سُن سُخنِ معتبر
ناخنِ تنقید سے وقت کے چھلکوں کو چھیل

دیکھ ابھرنے لگا سینۂ تہذیب سے
جادۂ تاریخ پر ایک نیا سنگِ میل

چشمِ ہنر کرکے وا دیکھ سوئے نینویٰ
بہرِ شہادت چلا شہرِ نبی کا خلیل

موڑدیا جس نے رُخ منطق تاریخ کا
حصّہٗ تاریخ ہے آج گلوئے قتیل

جزو ہیں تاریخ کا دشت کے جلتے خیام
غم سے خروشاں فرات دُکھ سے بلکتے نخیل

عرصہٗ جنگ و جدل مقتل ادراک ہے
دامنِ تہذیب کا سب سے بڑا چاک ہے

ماضی بے نام سے ڈھونڈھ رہی ہے زمیں
ایک الوٗہی سماج رشکِ خلدِ بریں

امن ہو جس کا ضمیر خیر ہو جس کا خمیر
عدل کی تہذیب ہو عقل کا تاج و نگیں

کاش اسے جان لے حکمتِ عصرِ رواں
عدل ہے تخلیق کا مرحلہٗ اوّلیں

عدل کی میزان میں تُل نہیں سکتی وہ نسل
جس کے لئے عیب ہو لُقمۂ نانِ جویں

چشمِ بصیرت شعار دیکھ رہی ہے وہ دن
جب ہو خرد خودشناس جب ہو نظر نکتہ بیں

ظلم کی تاریکیاں ذہن سے کافور ہوں
عدل کی شاخوں سے ہوں فنّ و ہنر خوشہ چیں

تفرقۂ عقل و دل دہر سے معدوم ہو
فکر کے ہر موڑ پر عقل ہو دل کے قریں

موجۂ ادراک پر ناؤ چلے نُطق کی
جذبہ و احساس ہوں دردِ بشر کے امیں

رنگِ روایت سے ہو رونقِ شہرِ گماں
شمعِ درایت سے ہو زینتِ طاقِ یقیں

دل کی گزرگاہ پر سایۂ ابرِ شعور
لب کی کمیں گاہ میں چشمۂ حرفِ متیں

آنکھ سے اوجھل نہ ہو مصلحتِ آستاں
اشک کو بوجھل نہ ہو مرحمتِ آستیں

میری زمیں کو ملیں ایسی حسیں گردشیں
سارے شب و روز ہوں ناز گر و نازنیں

گاہ شب ماہ کا جلوۂ نیرنگ ساز
گاہ شب تار کی ظلمتِ خوف آفریں

گاہ سویروں کی فوج خوش نسب و خوش نوا
گاہ اُجالوں کی موج خوش قدم و عنبریں

دامنِ کہسار میں پھولتے پھلتے رہیں
سرو و صنوبر کے ساتھ نسترن و یاسمیں

چشمۂ کہسار میں تیر رہے ہوں وہ ہنس
رُوکشِ خورشید ہو جن کی منوّر جبیں

ڈوبتے سورج سے ہو سرخ شفق زارِ شام
کوچۂ مہتاب میں گھوم رہے ہوں حسیں

دُخترِ کہسار پر رنگِ شفق کی ہو چھوٹ
عارض و لب گُل بہ کف چشمِ حیا سرگیں

اس کرۂ ارض پر نسلِ بشر دیکھ لے
سوزِ ازل دل نواز سازِ اَبد دل نشیں

عدل وہ تنویر دے دیدۂ امکان کو
چترِ سعادت ملے ہمّتِ انسان کو



کلاسیک
42- دی مال' لاہور

